داغ دہلوی

مخمور سعیدی

ہندوستانی
ادب کے
معمار

داغ دہلوی

داغ دہلوی

هندستانی ادب کے معمار

داغ دہلوی

مخمور سعیدی

ساہتیہ اکادمی

Daagh Dehlavi : A Monograph in Urdu by Makhmoor Saeedi on the Urdu Poet. Sahitya Akademi, New Delhi (2004), Rs. 25.

پہلا ایڈیشن : 2004

ساہتیہ اکادمی

ہیڈ آفس :

رویندر بھون-35 فیروز شاہ روڈ، نئی دہلی 110001

سیلز آفس :

'سواتی'، مندر مارگ، نئی دہلی 110001

علاقائی دفاتر :

جیون تارا بھون، 23اے/44 ایکس، ڈائمنڈ ہاربر روڈ، کولکاتا 700053

172، ممبئی مراٹھی گرنتھ سنگھرالے مارگ، دادر، ممبئی 400014

سینٹرل کالج کیمپس، ڈاکٹر بی۔ آر۔ امبیڈکر ویدھی، بنگلور 560001

سی۔ آئی۔ ٹی۔ کیمپس، ٹی۔ ٹی۔ آئی۔ پوسٹ، تارامنی، چنئی 600013

قیمت : 25 روپے

ISBN 81-260-1626-4

Website : http://www.sahitya-akademi.org

کمپیوٹر کمپوزنگ : محمد سالم 27/316 ترلوک پوری، دلّی 110091

طباعت : آر۔ کے۔ آفسیٹ، نوین شاہدرہ دلّی

فہرست

حرفِ چند

داغ نہ صرف اپنے زمانے کے مقبول ترین شاعر تھے بلکہ انھوں نے اپنی زندگی ہی میں ایک دبستاں کی حیثیت حاصل کرلی تھی۔ غالب نے کہا ہے :

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے، غزلخواں ہو گئیں

داغ کا نالۂ شوق ان کی شاعری تھی جس کا شہرہ ہندوستان بھر میں ہوا اور ملک کے کونے کونے سے اس فن کے طلبگاروں نے ان سے استفادہ کیا۔ ان کے شاگردوں کی تعداد، جو ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے تھے، پانچ ہزار تک بتائی گئی ہے۔ ان کے ایک ممتاز شاگرد نوح ناروی جو داغ کی وفات کے بعد ان کے جانشین بھی کہلائے، اس تعداد کو مبالغہ آمیز قرار دیتے ہیں، ان کی معلومات کی رو سے، ان کے استاد کے شاگردوں کی تعداد دو ہزار تھی۔ یہ تعداد بھی کچھ کم نہیں ہے۔ پھر ان کے شاگردوں نے بھی سیکڑوں شاگرد بنائے اور ان کی اس نہج پر ذہنی تربیت کی کہ ان کے شاگردوں کے شاگرد بھی استادی کے مرتبے پر فائز ہوئے اور ان سے بھی فنِ شعر کے نو آموزوں میں کسبِ فیض کا سلسلہ جاری رہا۔ اقبال اور سیماب جیسے شعرا کو بھی داغ سے نسبتِ تلمذ رہی۔ ان کی وفات پر اقبال نے جو مرثیہ کہا ہے اس میں انھیں جہان آباد (دلّی) کا آخری شاعر قرار دیا ہے :

آخری شاعر جہان آباد کا خاموش ہے

اور سچ یہی ہے کہ ان کے بعد دلّی کی سرزمین نے ایسا کوئی شاعر پیدا نہیں کیا جوان کی خالی جگہ پُر کر سکتا۔

داغ شاعری کی ان تمام اصناف پر قادر تھے، جو ان کے زمانے میں مروّج تھیں۔ دلّی کی تباہی پر انھوں نے شہر آشوب بھی لکھے، اپنے سرپرستوں کی شان میں قصیدے بھی کہے، تاریخی قطعات بھی ان سے یادگار ہیں، رباعیاں بھی ان کے ذخیرۂ کلام میں موجود ہیں لیکن ان کی پہلی پہچان بنی ان کی غزل اور دوسری حیثیت ملی ان کی مثنوی کو جو "فریادِ داغ" کے تاریخی نام سے مشہور و مقبول ہوئی اور کلکتے کی منی بائی حجاب سے ان کے معاشقے کی یادگار ہے۔

داغ کی غزل کی سب سے نمایاں خصوصیت جذبے کی سچائی اور اظہار کی بے تکلفی ہے۔ ان کی غزل فکری عنصر سے یکسر خالی نہیں، کم کم ہی سہی لیکن ان کی سوچ انھیں زندگی کے ان مظاہر تک لے جاتی ہے جن کا سامنا ایک فکر مند انسان ہی کر سکتا ہے۔ یہ فکر مندی ان کے ہاں مشاہدے کی راہ سے آئی۔ لڑکپن سے عمر کے آخری مراحل تک انھوں نے ایسے بہت سے نشیب و فراز دیکھے جو کسی بھی زندہ انسان کی آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی تھے۔ داغ شاید طبعاً عافیت پسند اور آرام طلب تھے، اس لیے دیر تک یا دور تک گرد و پیش کی ناہمواریوں کا مشاہدہ کر سکنے کی سکت ان میں نہیں تھی، گھبرا کر جلد ہی وہ خارجی دنیا کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتے اور اپنے گوشۂ عافیت میں سمٹ آتے تھے۔

داغ کا گوشۂ عافیت زنانِ بازاری کی صحبتیں تھیں۔ ان صحبتوں میں وہ دنیا و مافیہا کو فراموش کر کے حدیثِ لب و رخسار بیان کرنے بیٹھ جاتے اور اس بیان میں ایسی ایسی ندرتیں پیدا کرتے کہ سننے والے جھوم اٹھیں۔ دراصل جب انھوں نے شعور کی آنکھیں کھولیں وہ ہمارے تہذیبی زوال کا دور تھا، ملک کا سیاسی اور سماجی شیرازہ بکھر چکا تھا، مقامی طاقتیں باہم دست و گریباں تھیں جس کا فائدہ اٹھا کر ایک بیرونی طاقت ہر شعبۂ حیات پر اپنا اثر و اقتدار قائم کر چکی تھی۔ اس اثر و اقتدار کو آخری بار

۱۸۵۷ء میں جنرل بخت خاں نے للکارا تھا اور بوڑھے مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑا ہونے کی ترغیب دی تھی مگر یہ آخری کوشش بھی شکست انجام ہوئی اور بالآخر پورے ہندوستان پر غیر ملکی تسلط قائم ہو گیا۔ ہندوستان کی یہ سپر اندازی صرف سیاسی نہیں تھی، اس کے اثرات بہت دوررس ثابت ہوئے اور دھیرے دھیرے پورا معاشرہ نجی عافیت اور آرام کے ان گوشوں کی تلاش میں منہمک ہو گیا جو اسے میسّر آسکتے تھے ـــــ داغ اس معاشرے کے ایک نمائندہ فرد تھے۔ ان کی اور ان کی شاعری کی اس معاشرے نے جو پذیرائی کی اس کی وجہ یہی تھی۔ جس دور میں یہ معاشرہ زندہ تھا اس کے عمومی ذہنی میلانات اور ذوقی ترجیحات کو سمجھنے میں داغ کی شاعری ہماری مدد کر سکتی ہے۔ (اسی دور میں سر سیّد اور حالی بھی پیدا ہوئے مگر وہ out sider تھے، اس جاگیر دارانہ نظام کا حصہ نہیں تھے جس کی نمائندگی داغ کرتے ہیں، اسی لیے انھیں حالات کو اپنے طور پر دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا اور انھوں نے انھیں ایک نیا رخ دینے کی کوشش کی) جذبے کی سچائی کے ساتھ ساتھ اظہار کی بے تکلفی اور زبان کی سادگی اور سلاست، ایسی سادگی اور سلاست جیسے کسی خوش خرام ندی کا بہاؤ، داغ کی شاعری کی امتیازی خصوصیت ہے جس میں کوئی ان کا شریک نہیں۔

مثنوی "فریادِ داغ" بھی، جیسا کہ اوپر کہا گیا، داغ کے عاشقانہ مزاج ہی کی ودیعت ہے اور کلکتے کی ایک ڈیرے دار طوائف سے ان کے معاشقے کی روداد پر مبنی ہے۔ اردو میں سیکڑوں مثنویاں کہی گئی ہیں اور ان میں بعض مثنویوں کو شہرت و مقبولیت بھی ملی ہے۔ میر حسن کی مثنوی سحر البیان اور دیا شنکر نسیم کی گلزار نسیم تو اردو ادب کے ہر طالب علم نے سبقاً سبقاً بھی پڑھی ہیں۔ لیکن ہماری اکثر مثنویاں عام انسانوں سے سروکار نہیں رکھتیں۔ اکثر مثنویوں کا ماحول یا تو ماورائی ہے، ان میں خیالی باتیں کہی گئی ہیں یا پھر ان میں شہزادوں اور شہزادیوں کی جھوٹی سچی داستانیں بیان ہوئی ہیں۔ بیشک یہ داستانیں دلچسپ ہیں اور ان میں ان ادوار کی مجلسی زندگی کی عمدہ تصویر کشی بھی کی گئی ہے، جن ادوار میں یہ کہی گئی ہیں، اسی لیے ہم انھیں آج بھی مزے لے لے کر پڑھتے ہیں لیکن اگر ہم ان میں اپنے جذبات و محسوسات کی ترجمانی تلاش کریں

تو شاید ہمیں مایوسی ہو گی۔ "فریادِ داغ" کی خاص خوبی یہ ہے کہ یہ ایسے کرداروں کی داستانِ معاشقہ ہے جو اس زمین پر چلتے پھرتے ہیں اور اسی فضا میں سانس لیتے ہیں جس فضا میں آپ اور ہم زندہ ہیں۔ یہ داغ کا کمال ہے کہ انھوں نے اپنی اس سرگزشتِ عشق کو دیووں اور پریوں یا شہزادوں اور شہزادیوں کی قیاسی کہانیوں سے زیادہ دلچسپ بنادیا ہے۔ شاید اس کے لیے انھیں کوئی شعوری کوشش بھی نہ کرنی پڑی ہو کہ یہ ان کے دل کی آواز تھی اور اقبال نے کہا ہے :

بات جو دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

داغ کی شاعری کی وہ شہرت اور مقبولیت آج نہیں ہے جو ان کی زندگی میں تھی کیونکہ آج وہ لوگ اس دنیا میں نہیں جو ان کے مخاطبِ صحیح تھے لیکن ان کی شاعرانہ اہمیت اور ان کی شاعری کی فنی قدر و قیمت سے آج بھی انکار ممکن نہیں۔ وہ ان معنوں میں بڑے شاعر نہیں ہیں، جن معنوں میں مثال کے طور پر ہم میر، غالب یا اقبال کو بڑا شاعر کہتے ہیں لیکن اردو کے اہم شاعروں میں ہمیشہ ان کا شمار ہو گا اور یہ اعزاز بھی کچھ کم نہیں ہے۔

آئندہ صفحات میں داغ کے خاندانی پس منظر، ان کی زندگی کے مختلف مراحل اور ان کی شاعرانہ فتوحات کا ایک اجمالی خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ اختصار کے باوجود کوشش کی گئی ہے کہ کوئی پہلو تشنہ نہ رہے۔ آخر میں ان کے کلام کا انتخاب بھی شامل ہے۔ انتخاب کے دوران ان کے سبھی دواوین سامنے رکھے گئے ہیں تاکہ ان کے رنگِ سخن کی بھرپور جھلکیاں قارئین دیکھ سکیں۔

حسب نسب اور خاندان

پدری سلسلے سے داغ کے مورثِ اعلیٰ عارف جان تھے جو اپنے دو بھائیوں قاسم جان اور عالم جان کے ساتھ عہدِ احمد شاہ (۱۷۴۸ء تا ۱۷۵۴ء) میں واردِ ہندوستان ہوئے اور بادشاہ کے ایما پر اٹک میں وہاں کے صوبیدار مرزا محمد بیگ کے پاس ٹھہرے۔ قاسم جان اور عالم جان جلد ہی دہلی چلے آئے مگر عارف جان کئی برس تک اٹک ہی میں رہے۔ ۱۷۶۰ء کے لگ بھگ مرزا محمد بیگ نے عارف جان سے اپنی بیٹی کی شادی کر دی جس کے بطن سے ۱۷۶۲ء کے اوائل میں عارف جان کا پہلا بیٹا تولد ہوا جس کا نام نبی بخش رکھا گیا۔ لگ بھگ تین سال بعد ۱۷۶۵ء کے آس پاس عارف جان کے دوسرے بیٹے احمد بخش خاں کی ولادت ہوئی۔ اس کے سال بھر بعد ۱۷۶۶ء کے اوائل میں عارف جان، شاہ عالم (۱۷۵۹ء تا ۱۸۰۶ء) کے بلانے پر بیوی بچوں کے ساتھ دلّی چلے آئے۔ یہیں ۱۷۶۶ء کے اواخر میں ان کا تیسرا بیٹا الٰہی بخش خاں پیدا ہوا۔ (یہ وہی الٰہی بخش خاں معروف ہیں جنھیں ہم مرزا غالب کے خسر کی حیثیت سے جانتے ہیں)

احمد بخش خاں مولانا فخر الدین چشتی سے، جو اپنے وقت کے اہل اللہ میں سے تھے، بیعت تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک دن جب احمد بخش انھیں وضو کرا رہے تھے، مولانا موصوف نے انھیں والیِ میوات کہہ کر مخاطب کیا جو بالآخر سچ ثابت ہوا۔

مولانا فخر الدین چشتی کی وفات ۲۰ نومبر ۱۷۸۵ء کو ہوئی۔ اس کے اگلے سال احمد بخش خاں بہ سلسلۂ ملازمت گوالیار چلے گئے اور وہاں زمرۂ سواراں میں ملازم ہو گئے۔ کئی برس بعد ۱۷۹۹ء کے دوسرے نصف میں جب وہ اجمیر سے دلّی آ رہے تھے، ان کی ملاقات الور کے راجا بختاور سنگھ سے ہوئی اور وہ ان کے ملازم ہو کر الور چلے گئے۔ اس کے تین یا چار سال بعد احمد بخش خاں کی بہن کی شادی مرزا غالب کے چچا، نصر اللہ بیگ خاں کے ساتھ ہوئی۔

۱۸۰۳ء میں لسواڑی کی لڑائی میں راجا بختاور سنگھ کے ایما پر احمد بخش خاں نے اپنے فوجی دستے کے ساتھ انگریزوں کی مدد کی۔ وہ بہت بہادری سے لڑے اور انھوں نے خطرے میں کود کر ایک انگریز سپہ سالار کی جان بھی بچائی۔ انگریزوں کی فتح ہوئی اور اگلے سال جب اس فتح کی خوشی میں دربار منعقد ہوا تو لارڈ لیک نے راجا بختاور سنگھ کو ۱۴ نئے علاقے جاگیر میں دیے اور احمد بخش خاں کو جو سند دی گئی اس میں انھیں فخر الدولہ، دلاور الملک، نواب احمد بخش خاں بہادر، رستم جنگ لکھوایا اور فیروز پور جھرکہ، پوناہانا، بچھور، سانگرس، نگینہ کے اضلاع بہ طور جاگیر انھیں دیے۔ اس جاگیر میں پرگنہ لوہارو کا اضافہ راجا بختاور سنگھ نے اپنی طرف سے کیا۔ اب احمد بخش خاں کو نواب احمد بخش خاں بہادر والیِ فیروز پور جھرکہ ولوہارو کہا جانے لگا۔

گھاٹا شمس آباد ضلع گوڑگاؤں کے ایک شخص منسارام میو کی دو بیٹیاں موسیٰ اور مدیٰ نام کی تھیں۔ ان پر راجا بختاور سنگھ کی نظر پڑی۔ اس نے موسیٰ کو اپنے پاس رکھ لیا اور مدیٰ کو احمد بخش خاں نے اپنے لیے پسند کر لیا۔ ۱۸۰۹ء میں اسی کے بطن سے احمد بخش خاں کے بیٹے شمس الدین احمد خاں پیدا ہوئے۔

شمس الدین احمد خاں کی پیدائش کے تین سال بعد ۱۸۱۲ء کے آس پاس احمد بخش خاں کی شادی بیگم جان سے ہوئی جو نیاز محمد بیگ خاں مغل برلاس کی بیٹی تھی۔ احمد بخش خاں کے بیٹے امین الدین احمد خاں ۱۸۱۴ء میں اسی کے بطن سے پیدا ہوئے اور اس سے ذرا پہلے یا فوراً بعد احمد بخش خاں نے مدیٰ کے اپنی باقاعدہ بیوی ہونے کا اعلان کیا اور اسے بہو بیگم کا لقب بھی دیا۔ اس طرح شمس الدین احمد خاں ان کے قانونی

وارث ہوگئے۔ بیگم جان سے احمد بخش خاں کے دوسرے بیٹے ضیاء الدین احمد خاں، پہلے بیٹے کی پیدائش کے لگ بھگ سات برس بعد ۱۸۲۱ء میں پیدا ہوئے۔ اکتوبر ۱۸۲۷ء میں احمد بخش خاں کا انتقال ہو گیا۔ انھوں نے اپنی زندگی ہی میں اپنی جاگیر اپنے بیٹوں میں تقسیم کر دی تھی اور ان کے بڑے بیٹے شمس الدین احمد خاں کو نوابی کے لقب کے ساتھ والیِ فیروز پور جھرکہ تسلیم کر لیا گیا تھا۔ لوہاروان کے سوتیلے بھائیوں امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں کے حصے میں آیا۔ ۱۸۲۲ء میں احمد بخش نے انگریزی حکومت اور ریاست الور سے اس کی منظوری لے لی تھی جس پر جنرل آکڑلونی اور سر جان مٹکاف کے دستخط کرا لیے گئے تھے۔ احمد بخش خاں کے انتقال کے وقت شمس الدین احمد خاں اٹھارہ انیس سال کے تھے اور ان کے سوتیلے بھائیوں امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں کی عمریں بالترتیب گیارہ سال اور چار سال تھیں۔ ان کی کم عمری کی وجہ سے شمس الدین احمد خاں لاہارو پر بھی قابض ہو گئے لیکن بالآخر ولیم فریزر کی کوشش سے، جو دلّی کا ریزیڈنٹ تھا، لوہاروان کے دونوں سوتیلے بھائیوں کے تصرف میں چلا گیا۔ اس کا اثر شمس الدین احمد خاں پر یہ ہوا کہ وہ ولیم فریزر کے سخت مخالف ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ اس مخالفت میں اس وقت اور شدّت آ گئی جب کسی موقعے پر شمس الدین احمد خاں کی موجودگی میں اس نے ان کی بہن جہانگیرہ بیگم کی خوبصورتی کی تعریف کی ("بزم داغ" کا ایک بیان، بحوالہ داغ، ص ۲۱۵) ولیم فریزر اپنی رنگین مزاجی اور ہندوستانی عورتوں کی طرف خصوصی رغبت کے لیے بدنام تھا۔ بقول ڈاکٹر خلیق انجم ایک روایت یہ بھی ہے کہ فریزر نے شمس الدین احمد خاں کی داشتہ اور داغ کی والدہ چھوٹی بیگم سے بھی تعلق قائم کر لیا تھا۔

۲۲ مارچ ۱۸۳۵ء کی رات کو ولیم فریزر کو کسی نے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ ابتدائی تفتیش کے بعد پولیس نے شمس الدین احمد خاں کے داروغہ شکار کریم خاں کو فریزر کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا۔ کچھ دن بعد ان کا ایک اور نوکر واصل خاں بھی مشتبہ حالت میں گرفتار ہوا اور پھر شک کی سوئی شمس الدین احمد خاں کی طرف بھی گھوم گئی۔ تحقیقات کنندہ مجسٹریٹ نے انھیں لکھا کہ تحقیقات کو مکمل کرنے کے لیے

آپ کی مدد کی ضرورت ہے، آپ کچھ دن کے لیے دتی آ جائیں۔ شمس الدین احمد خاں نے اپنے افرادِ خاندان اور دیگر خیر خواہوں کے اس مشورے کے برعکس کہ وہ دتی جانے کے بجائے پنجاب، سکھ علاقے میں چلے جائیں، کسی بھرم میں دہلی جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ ۱۸ اپریل ۱۸۳۵ء کو دتی پہنچ گئے جہاں انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ ان کے خسر مرزا مغل بیگ خاں پر بھی بہت سختی کی گئی اور کچھ دن انھیں نظر بند بھی رکھا گیا۔ ۲۱ ستمبر ۱۸۳۵ء کو گورنر جنرل نے بہ اجلاس کونسل انھیں ولیم فریزر کے قتل کی انگیخت کے جرم میں پھانسی کی سزا سنائی جس کی تعمیل میں ۸ اکتوبر ۱۸۳۵ء کی صبح کشمیری دروازے کے باہر شمس الدین احمد خاں کو پھانسی دے دی گئی۔ ایک گھنٹے تک لاش پھانسی پر لٹکی رہی، اس کے بعد نواب کے خسر مرزا مغل بیگ کے حوالے کر دی گئی جنھوں نے اسے لے جا کر قدم شریف میں دفن کرا دیا۔ بقول مالک رام (ذکرِ غالب، ص ۳۶) اس وقت نواب شمس الدین احمد خاں کی عمر صرف ۲۵ برس تھی۔

داغ کی والدہ وزیر بیگم عرف چھوٹی بیگم جو محمد یوسف کشمیری سادہ کار کی تین بیٹیوں میں سب سے چھوٹی اور سب سے حسین تھیں، ۱۸۱۳ء کے آس پاس پیدا ہوئی تھیں۔ وہ ۱۸۳۰ء میں تقریباً سترہ برس کی عمر میں نواب شمس الدین احمد خاں سے وابستہ ہوئیں اور اس وابستگی کے ایک سال بعد ۲۵ مئی ۱۸۳۱ء کو بدھ کے دن داغ کی ولادت ہوئی۔ چاندنی چوک کے جس مکان میں داغ پیدا ہوئے وہ نواب شمس الدین احمد خاں ہی نے چھوٹی بیگم کو دلا رکھا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ داغ کا اصلی نام ابراہیم تھا۔ بعد میں انھیں نواب مرزا کہا جانے لگا۔ داغ سوا چار سال کے ہوں گے جب ان کے والد شمس الدین احمد خاں کو انگریزی حکومت نے پھانسی دی۔ داغ چاندنی چوک کے جس کوچے میں پیدا ہوئے تھے اب اس کا نام انھی کے نام پر کوچہ استاد داغ ہے۔

داغ کے نانا محمد یوسف کشمیری پیشے سے سادہ کار یعنی سنار تھے لیکن ڈیرے داری بھی کیا کرتے تھے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا، ان کی تین بیٹیاں تھیں۔ بڑی بیٹی کا نام راحت النساء تھا۔ اس نے باقاعدہ شادی کر لی تھی، منجھلی عمدہ بیگم نواب یوسف علی خاں والیِ رامپور سے ان کے زمانۂ ولی عہدی سے وابستہ ہو گئی تھی۔ داغ کی والدہ وزیر بیگم

عرف چھوٹی بیگم کا تعلق یکے بعد دیگرے پانچ لوگوں سے ثابت ہے۔ نواب شمس الدین احمد خاں (۳۰-۱۸۲۹ء تا اکتوبر ۱۸۳۵ء) ایک انگریز مارسٹن بلاک جو جے پور میں کسی اہم سرکاری عہدے پر تھا۔ (۱۸۳۶ء) آغا تراب علی (۱۸۴۰ء) نواب شمس الدین احمد خاں کے سوتیلے بھائی نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر درخشاں (۱۸۴۳ء) اور مرزا فخرو (۱۸۴۴ء تا ۱۸۵۶ء)

داغ کے علاتی بہن بھائی کئی تھے ان کی تفصیل درج ذیل ہے :

والد یعنی شمس الدین احمد خاں کی طرف سے :

بیوی افضل النسا بیگم کے بطن سے دو بہنیں احمد النسا بیگم اور شمس النسا بیگم اور داشتہ چمپا کے بطن سے ایک بہن رحمت النسا بیگم ـــــ داغ نے ان تینوں بہنوں سے کوئی واسطہ نہیں رکھا۔

والدہ کی طرف سے :

مارسٹن بلاک کے صلب سے ایک بھائی امیر مرزا اور ایک بہن بادشاہ بیگم خفی۔ آغا تراب علی سے ایک بھائی آغا مرزا شاغل اور مرزا فخرو سے ایک بھائی مرزا خورشید عالم خورشید۔ داغ کے تعلقات ان سب کے ساتھ مشفقانہ رہے اور مختلف طریقوں سے انھوں نے ان کی مدد کرنے کی بھی کوشش کی۔

کالی داس گپتا رضا کے مطابق داغ کی بڑی خالہ راحت النسا بیگم (جو حافظ ولی محمد ولد عبدالصمد کشمیری سے بیاہی گئی تھیں) کی تین بیٹیاں تھیں۔ ان کی بڑی بیٹی فاطمہ بیگم داغ سے بیاہی گئیں مگر ان کے ہاں اولاد نہیں ہوئی۔ اولاد سے محرومی کی تلافی داغ کی بیوی نے اس طرح کی کہ اپنی منجھلی بہن اولیا بیگم کی نواسی لاڈلی بیگم کو گود لے لیا۔ داغ نے اپنے بھائی امیر مرزا (ولد مارسٹن بلاک) کے بیٹے احمد کو بھی متبنیٰ بنا لیا تھا مگر وہ ایّام شیر خوارگی ہی میں مر گیا۔ داغ کے دیوانِ اوّل ''گلزارِ داغ'' کی ایک غزل کے آخری دو شعر اسی احمد سے متعلق ہیں :

احمد کے غم میں دیدہ و دل کیوں نہ ہوں تباہ
دل کا سرور تھا، مری آنکھوں کا نور تھا
اے داغ! صدمہ غم ہجراں بجا، درست
یہ سب سہی مگر تمھیں جینا ضرور تھا

داغ کا مقطع غالب کے مقطعے کی یاد دلاتا ہے :

صبر کرتے ہی بنے گی غالب
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

بعض لوگوں کا بیان ہے کہ فاطمہ بیگم داغ کی خالہ عمدہ بیگم کی بیٹی تھیں اور ان کا تعلق چونکہ صرف نواب یوسف علی خاں ناظم ہی سے رہا اس لیے فاطمہ بیگم کے والد نواب صاحب تھے۔

داغ کی لے پالک بیٹی لاڈلی بیگم کی پہلی شادی نواب سراج الدین احمد خاں سائل کے برادرِ خورد نواب ممتاز الدین احمد خاں سے ہوئی تھی۔ ان کا انتقال ہو گیا تو سائل نے دوسری شادی لاڈلی بیگم سے کرلی۔ داغ کے رشتے سے حیدر آباد سے لاڈلی بیگم کو تین سو روپے ماہوار وظیفہ ملتا تھا۔ سائل نے ان سے نکاح کیا تو داغ نے سفارش کر کے دو سو روپے ماہانہ ان کا وظیفہ بھی مقرر کرادیا۔ سائل داغ کے شاگرد بھی تھے اور داغ کے انتقال کے بعد ان کے جانشین بھی کہلائے۔

لال قلعے تک رسائی

۱۸۴۴ء میں جب داغ کی والدہ چھوٹی بیگم کی عمر تیس برس سے تجاوز کر چکی تھی، بادشاہِ دہلی کے ولیعہد مرزا محمد سلطان فتح الملک بہادر المعروف بہ مرزا فخرو نے انھیں دیکھا اور ان کے حسن و جمال پر فریفتہ ہو گئے، مولانا محمد حسین آزاد کا بیان ہے (دیباچہ دیوانِ ذوق) کہ مرزا فخرو ابھی ولیعہد نہیں بنے تھے۔ ان کی عمر اس وقت ۲۵،۲۴ سال رہی ہو گی، یعنی وہ چھوٹی بیگم سے پانچ چھ سال چھوٹے تھے۔ انھوں نے چھوٹی بیگم کی تصویر استاد ذوق کو دکھا کر اپنی پسند کی داد چاہی لیکن ذوق نے مرزا فخرو کی پسند کو سراہنے کے بجائے چھوٹی بیگم کی بد چلنیوں کا ذکر چھیڑ دیا اور شہزادے کو ان سے دور رہنے کا مشورہ دیا۔ مرزا فخرو چھوٹی بیگم پر دل و جان سے عاشق ہو گئے تھے۔ کچھ دن بعد انھوں نے ان سے نکاح کر لیا اور وہ مرزا فخرو کی تیسری بیگم بن کر قلعے میں آگئیں۔ کہا جاتا ہے کہ مرزا فخرو نے انھیں نواب شوکت محل کے خطاب سے بھی نوازا تھا۔ مگر یہ روایت زیادہ معتبر نہیں۔

یہ داغ کے عنفوانِ شباب کا زمانہ تھا۔ اس وقت ان کی عمر ۱۳، ۱۴ سال کے درمیان رہی ہو گی۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ لال قلعے میں پہنچے تو وہاں ان کی تعلیم اور مختلف فنون میں ان کی تربیت کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ اگرچہ اس وقت مغلوں کی حکومت اپنے زوال کی آخری حدوں کو چھو رہی تھی لیکن لال قلعہ اب بھی مرجعِ خاص و عام

تھا۔ داغ نے مرزا غلام حسین شکیبا، شاگردِ میر تقی میر کے بیٹے مولوی سید احمد حسین سے فارسی کی درسی کتابیں پڑھیں، میر پنجہ کش دہلوی سے خوش نویسی کے فن، مرزا عبیداللہ بیگ سے بانک، مرزا سنگی بیگ سے پھکیتی، بجن اور بندو خاں سے گھوڑ سواری کی تربیت حاصل کی۔ تیر اندازی، چورنگ اور بندوق چلانا داغ کو خود مرزا فخرو نے سکھایا۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ داغ نے ان کے دل میں کیسی جگہ بنالی تھی اور وہ انھیں کتنا عزیز رکھنے لگے تھے۔ شاعری میں بھی داغ کے پہلے استاد مرزا فخرو ہی تھے، خود داغ کے بیان کے مطابق انھوں نے اپنی کچھ ابتدائی غزلوں پر مرزا فخرو سے باقاعدہ اصلاح لی تھی۔ پھر انھی کے مشورے پر ذوق کے شاگرد ہوئے۔ داغ پہلے مرزا تخلص کرتے تھے، داغ تخلص بھی مرزا فخرو ہی نے دیا۔ داغ کا بیان ہے کہ وہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی درگاہ میں ذوق کے شاگرد ہوئے جہاں شاہ ظفر اور ولیعہد مرزا فخرو بھی موجود تھے۔ مرزا فخرو نے داغ کی طرف سے ذوق کو ایک دوشالہ اور کچھ اشرفیاں پیش کیں اور ذوق نے اسی وقت ان کی ایک غزل پر اصلاح کی۔ تب سے ان کا یہ معمول ہو گیا کہ وہ روزانہ سہ پہر کے وقت استاد کی خدمت میں حاضر ہوتے اور مغرب تک وہاں رہتے۔ داغ نے یہ بھی لکھا ہے کہ ذوق بادشاہ کی غزل اور ان کی غزل پر "خود اپنے دست و قلم سے اصلاح فرمایا کرتے تھے" دوسرے شاگردوں کی غزلیں کوئی دوسرا پڑھتا جاتا اور وہ اصلاح دیتے جاتے۔ انھوں نے ذوق سے خود ان کے بیان کے مطابق ۱۸۵۴ء تک اصلاح لی جو ذوق کا سالِ وفات ہے۔ اس وقت داغ ۲۳ سال کے تھے۔

داغ کے شاگرد احسن مارہروی کا بیان ہے کہ ایک دفعہ غالب نے قلعے میں اپنی وہ غزل پڑھی جس کا مشہور شعر ہے :

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بہت بے آبرو ہوکر ترے کوچے سے ہم نکلے

بادشاہ ظفر کو یہ زمین بہت پسند آئی، حکم ہوا کہ اس طرح میں مشاعرہ ہو۔ چنانچہ مشاعرہ منعقد ہوا۔ بہ قولِ داغ ان کی جوانی کا زمانہ تھا، طبیعت پورے جوش پر تھی۔

غزل کہی اور مشاعرے میں پہنچے۔ جب یہ شعر پڑھا :

ہوئے مغرور وہ، جب آہ میری بے اثر دیکھی
کسی کا اس طرح یا رب نہ دنیا میں بھرم نکلے

بادشاہ نے بہت داد دی اور اپنے پاس بلا کر پیشانی پر بوسہ دیا۔" داغ کے پاس مصرعۂ طرح اسی دن پہنچا تھا جس دن رات کو مشاعرہ تھا۔ انھوں نے غزل کہہ کر دیوانِ خاص ہی میں ذوق کو دکھائی۔ انھوں نے تمام شعروں پر صاد کیا، اتنے میں بادشاہ تشریف لے آئے اور مشاعرہ شروع ہو گیا۔

داغ کی والدہ چھوٹی بیگم پر ولیعہد سلطنت مرزا فخرو کا، اس کے باوجود کہ وہ عمر میں ان سے کئی برس بڑی تھیں، فریفتہ ہو جانا اور ان کے ساتھ داغ کی بھی لال قلعے میں رسائی داغ کی زندگی کا اہم واقعہ ہے۔ لال قلعے میں مرزا فخرو نے جہاں ان کی تعلیم و تربیت کا بہتر سے بہتر سر و سامان کیا وہیں قلعے میں رہ کر مغل بیگمات، مغل شہزادوں اور شہزادیوں کے طرزِ معاشرت، تہذیبی رکھ رکھاؤ اور آدابِ گفتگو سے انھیں قریبی واقفیت ہوئی۔ ذوق جیسے استادِ سخن نے ان کے شاعرانہ ذہن و ذوق کی تربیت کی اور قلعے میں بولی جانے والی ٹکسالی زبان پر وہ قابض و متصرف ہو گئے۔

۱۰ جولائی ۱۸۵۶ء کو مرزا فخرو کو ہیضہ ہوا اور چند گھنٹوں میں انھوں نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ انھیں زہر دیا گیا۔ داغ کی عمر اس وقت پچیس برس ہو گی۔ ان پر اس سانحے کا بہت اثر ہوا۔ انھوں نے مرزا فخرو کے انتقال کی جو تاریخ کہی ہے اس سے ان کی دلی کیفیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ تاریخ فارسی میں ہے :

غمِ فتحِ ملکِ سلطاں چہ بلائے جان و دل شد
دہدش مقامِ جنّت ز کرمِ کریمِ غفّار
چو ز داغ سالِ رحلت دلِ دردمند پُرسید
بکشید آہِ حسرت دو صد و دوازدہ بار

ترجمہ : (محمد) سلطان فتح الملک کا غم دل و جاں پر بلا بن کر نازل ہوا ہے

کرم گستر اور بخشش کرنے والا (خدا) انھیں اپنے کرم سے جنت میں
جگہ دے

داغ سے جب دل وردمند نے ان کا سال رحلت پوچھا
تو اس نے دو سو بارہ مرتبہ حسرت آمیز آہ کھینچی

. بہ حسابِ ابجد "آہ" کے عدد چھ ہیں۔ اسے ۲۱۲ سے ضرب دی جائے تو ۱۲۷۲ کے عدد حاصل ہوں گے۔ ہجری سنہ میں یہی مرزا فخرو کا سالِ رحلت ہے جو برابر ہے ۱۸۵۶ء کے۔

مرزا فخرو کے انتقال کے بعد داغ اور ان کی والدہ کو قلعہ چھوڑ دینا پڑا اور وہ غالباً اسی چاندنی چوک والے مکان میں منتقل ہو گئے جو چھوٹی بیگم کو نواب شمس الدین احمد خاں نے دلوایا تھا۔

دربار رامپور سے وابستگی

قلعے سے بے دخلی کے بعد ۱۸۵۶ء کے باقی ماندہ مہینے اور ۱۸۵۷ء کا سال داغ اور ان کی والدہ نے زیادہ تر دلّی میں گزارا۔ قلعے سے ان کی والدہ کی تنخواہ مقرر تھی جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ دار و گیر تک انھیں ملتی رہی۔ جب قلعہ اور قلعے والے نہ رہے تو یہ تنخواہ بھی نہ رہی۔ اپنے ایک مقطعے میں حسرت بھرے انداز میں کہتے ہیں :

اے داغ اہلِ قلعہ کا لٹنا تو درکنار
تنخواہ تک خزانۂ شاہی میں رہ گئی

داغ کو دلّی اور اور دلّی والوں کی بربادی کا غم تھا مگر وہ اس کا ذمہ دار خود ہندوستانیوں کو سمجھتے تھے جنھوں نے انگریزی حکومت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا تھا۔ داغ نے اپنے شہر آشوب میں جو انھوں نے اس واقعے کے بعد کہا تھا، دلّی اور دلّی والوں کی بربادی کا بڑا درد انگیز نقشہ کھینچا ہے :

لہو کے چشمے ہیں چشمِ پُر آب کی صورت
شکستہ کاسۂ سر ہیں، حباب کی صورت
لٹے ہیں گھر، دلِ خانہ خراب کی صورت
کہاں یہ حشر میں، توبہ، عذاب کی صورت

زبانِ تیغ سے پرسش ہے داد خواہوں کی
رسن ہے، طوق ہے، گردن ہے بے گناہوں کی

مگر وہ اس صورتِ حال کا ذمہ دار ان ہندوستانیوں کو ٹھہراتے ہیں جنھوں نے انگریز حکام کے خلاف سر اٹھانے کی جرأت کی تھی :

غضب میں آئی خدائی بلا میں شہر آیا
یہ پُرپیے نہیں آئے، خدا کا قہر آیا

"پُرپیے" یعنی جنرل بخت خاں اور ان کے سپاہی۔ دراصل اس زمانے تک قومیت کا موجودہ تصور پیدا نہیں ہوا تھا اس لیے انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اثر و اقتدار کے منفی پہلوؤں سے ایک عام شہری کو کچھ زیادہ سروکار نہ تھا۔ کچھ ذاتی وفاداریاں ضرور تھیں اور وہ بھی اس طرح کی تھیں کہ بدلتے وقت کے ساتھ بدل سکتی تھیں۔

داغ کی خالہ عمدہ خانم نواب یوسف علی خاں ناظم کے زمانۂ ولیعہدی سے ان سے وابستہ تھیں۔ داغ ۱۸۵۷ء کے آخر میں یوسف علی خاں کے نام، جو اب والیِ رامپور تھے، اپنی خالہ کا سفارشی خط لے کر رامپور پہنچے۔ یوسف علی خاں نے ان کی پذیرائی کی اور وہ سال بھر تک وہاں رہے۔ ۱۸۵۹ء کے شروع میں وہ دلّی واپس آگئے۔ اس کے بعد بھی دلّی اور رامپور کے درمیان ان کی آمد و رفت جاری رہی، یوسف علی خاں نے ان کی مہماں نوازی تو کی لیکن انھیں کوئی منصب نہیں دیا۔ ان کی وفات (۲۹ اپریل ۱۸۶۵ء) تک وہ ولیعہد کلب علی خاں کے مصاحبوں میں شامل رہے۔ ان کے نواب ہو جانے کے لگ بھگ سال بھر بعد ۴ اپریل ۱۸۶۶ء کو انھیں ستر روپے ماہانہ پر فراش خانے اور اصطبل کا داروغہ مقرر کیا گیا۔ اس تقرر کے بعد کا ایک دلچسپ واقعہ خود ان کی زبانی سنیے :

"ہم رامپور پہنچے اور ہمیں اصطبل کی افسری عطا ہوئی تو بعض لوگوں میں اس اعزاز کی بنا پر رشک و رقابت کے جذبات ابھرے اور ہر طرح مخالفت کی گئی اور اکثر معاملات میں بعض لوگ بظاہر یا باطن حارج ہوئے۔ ایک روز عجیب واقعہ ہوا۔ صبح کو جب اصطبل پہنچے تو

دروازے پر ایک کاغذ چسپاں دیکھا۔ غور کیا تو اس کاغذ پر یہ شعر لکھا ہوا تھا :

شہر دہلی سے آیا اک مشکی
آتے ہی اصطبل میں داغ ہوا

یہ شعر ہماری ہجو میں تھا لیکن اس شعر میں جن لفظی رعایتوں سے کام لیا گیا تھا اور ہمارے کالے رنگ اور گھوڑے کی مُشکی قسم کی رعایت سے جو ستم ظریفی کی گئی تھی، اس کو محسوس کر کے بے اختیار داد دینے کو دل چاہا۔ ہمارے نام کی رعایت سے جو گھوڑے داغے گئے تھے، اس نے اور زیادہ لطف دیا۔ میں نے لوگوں سے اس شعر کے کہنے والے کے متعلق بہت معلوم کیا۔ اعلان بھی کیا کہ اس شعر کا کہنے والا کون ہے اگر مجھ سے آکر ملے تو میں نہ صرف یہ کہ اس سے مل کر خوش ہوں گا بلکہ اس کی شاعرانہ طبّاعی اور ذہانت کی داد بھی دوں گا۔ لیکن افسوس باوجود کوشش اس شعر کے مصنّف کا پتہ نہ چل سکا۔"

محمد علی خاں اثر رامپوری کے مطابق یہ شعر میر احمد علی رسا رامپوری کا ہے لیکن کالی داس گپتا رضا نے اسے ان کے شاگرد شیخ علی بخش بیمار سے منسوب کیا ہے۔ شعر جس کا بھی ہو، ظاہر ہے داغ کی تضحیک کے لیے کہا گیا تھا، یہ داغ کی اعلیٰ ظرفی اور شاعری کے فن سے ان کا غیر معمولی شغف تھا کہ انھوں نے اس شعر پر کسی ناخوشی کا اظہار نہیں کیا بلکہ اس میں جو شاعرانہ ذہانت کار فرما تھی اس سے وہ لطف اندوز ہوئے۔

دلّی اور لکھنؤ کے تہذیبی اور ادبی مراکز ۱۸۵۷ء کے بعد اجڑ گئے تھے اور وہاں کے اہلِ کمال اپنے قدر شناسوں کی سرپرستی سے محروم ہو کر پریشاں حالی میں مبتلا تھے۔ رامپور جغرافیائی اعتبار سے ان دونوں مراکز کے درمیان واقع تھا۔ وہاں کے حکمراں نواب یوسف علی خاں ناظم نے باغیوں اور انگریزوں کی آویزش میں انگریزوں کا ساتھ دیا تھا اس لیے وہ انگریزوں کے عتاب سے محفوظ رہے اور بہت سی مراعات کے بھی حقدار ٹھہرے۔ امن واماں بحال ہوا تو ریاستِ رامپور پریشاں حال اہلِ کمال

کے لیے ایک پناہ گاہ کی حیثیت اختیار کر گئی اور دونوں طرف سے شاعر، ادیب اور دوسرے فنکار وہاں آکر جمع ہو گئے۔ شعرا میں امیر احمد امیر مینائی، امیر اللہ تسلیم، سید ضامن علی جلال، شیخ امداد علی بحر، منیر شکوہ آبادی اور منشی مظفر علی اسیر جیسے شاعروں کی رامپور میں موجودگی نے اس شہر کو دلّی اور لکھنؤ جیسی رونق بخش دی تھی۔ کلب علی خاں کی مسند نشینی کے بعد داغ کی رامپور دربار سے مستقل وابستگی نے اس رونق کو دوبالا کر دیا اور وہاں دلّی اور لکھنؤ کے دبستانوں کی امتیازی خصوصیات کی باہمی آویزش اور آمیزش ایک نئے طرزِ سخن کی ایجاد کا سبب بھی بنی۔

داغ اور رامپور کا رشتہ پرانا تھا۔ جیسا کہ معلوم ہے، ان کی خالہ عمدہ خانم جنھوں نے ان کی پرورش بھی کی تھی، نواب یوسف علی خاں کے زمانۂ قیامِ دلّی سے ان سے وابستہ تھیں۔ نواب محمد سعید خاں کی تخت نشینی کے بعد جب یوسف علی خاں اور عمدہ خانم رامپور آئے تو داغ بھی ان کے ساتھ تھے۔ اس وقت وہ نو سال کے تھے۔ وہاں انھوں نے مولف غیاث اللغات مولوی غیاث الدین سے فارسی پڑھی اور کہا جاتا ہے کہ خود نواب یوسف علی خاں نے بھی انھیں سکندر نامہ پڑھایا تھا۔

رامپور میں داغ کی زندگی آرام و آسائش کی زندگی تھی۔ نواب کلب علی خاں ان کی مقررہ تنخواہ کے علاوہ اپنی جیب خاص سے بھی انھیں کچھ دیتے رہتے تھے۔ دیگر کئی اشعار کے علاوہ داغ نے درج ذیل مقطعے میں بھی اس کا اعتراف کیا ہے :

رئیسِ مصطفےٰ آباد کے نوکر ہوئے جب سے
کہیں کیا داغ ہم، آرام ہم نے کس قدر پایا

دسمبر ۱۸۶۶ء میں نواب صاحب کے کلکتے کے سفر میں داغ ان کے ہمرکاب تھے اور ۱۸۷۲ء میں جب نواب صاحب حج بیت اللہ کو گئے تو ان کے ساتھ داغ کو بھی یہ سعادت نصیب ہوئی۔ گلزارِ داغ (طبع اول) کے صفحہ نمبر ۱۱۱ پر درج ایک غزل کے مقطعے میں داغ کہتے ہیں :

یہ سنا جو حضرتِ داغ نے کہ حضور کعبے کو جائیں گے
یہی ذکر ہے، یہی فکر ہے، شب و روز عزمِ سفر سے خوش

کعبۃ اللہ کے سامنے بیٹھ کر انھوں نے ایک غزل کہی جس کا انداز حمد یہ ہے۔ اس غزل کے چند شعر یہ ہیں :

سبق ایسا پڑھا دیا تو نے — دل سے سب کچھ بھلا دیا تو نے
لاکھ دینے کا ایک دینا ہے — دلِ بے مدّعا دیا تو نے
بے طلب جو ملا، ملا مجھ کو — بے غرض جو دیا، دیا تو نے
تھا مرا منہ نہ قابلِ لبیک — کعبہ مجھ کو دکھا دیا تو نے

داغ کو کون دینے والا تھا
جو دیا اے خدا دیا تو نے

ان اشعار بلکہ اس غزل کے اکثر اشعار سے (یہ غزل ۲۱ شعروں پر مشتمل ہے) داغ کے اس جذبۂ عبودیت کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے، جس سے وہ اس وقت سرشار تھے۔ حج سے واپسی پر بھی انھوں نے ایک غزل کہی جس کا مقطع ہے :

ساتھ نواب کے حج کرکے پھرے ہم اے داغ
ہند میں دھوم ہے مہمانِ حجاز آتے ہیں

حج کے لیے وہ نومبر ۱۸۷۲ء میں روانہ ہوئے تھے اور مارچ ۱۸۷۳ء میں یعنی پانچ مہینے بعد واپس رامپور پہنچے۔ ۱۸۷۸ء میں ان کا پہلا دیوان "گلزار داغ" شائع ہوا۔ اگلے سال ۱۸۷۹ء میں ان کی والدہ چھوٹی بیگم نے وفات پائی اور اسی سال پہلی بار داغ منّی بائی حجاب سے ملے۔

ڈھلتی عمر کا معاشقہ

داغ زیارتِ حرمین شریفین تو کر آئے مگر بتانِ ہند سے انھیں جو لگاؤ اور شغف تھا اس میں کوئی کمی نہ آئی۔ رامپور میں شہر سے کچھ فاصلے پر بے نظیر باغ کے نام سے ایک باغ اور اس باغ میں ایک کوٹھی تھی جو نواب احمد علی خاں کی بنوائی ہوئی تھی۔ اس باغ کی خوبصورتی اور دلکشی کو داغ نے اس طرح خراجِ تحسین پیش کیا ہے :

ہو چکا ذکرِ خلد اے واعظ
وہ بھی کیا بے نظیر باغ ہوا

اسی بے نظیر باغ میں نواب کلب علی خاں نے ایک سالانہ میلے کی طرح ڈالی جو مارچ کے آخری ہفتے میں شروع ہوتا تھا اور آٹھ دس دن تک جاری رہتا تھا۔ میلے کا اہتمام شاہانہ شان کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ شعر و سخن اور رقص و سرود کی محفلیں بھی آراستہ ہوتیں۔ باغ کے آس پاس شامیانے لگا دیے جاتے جن میں بیرونی مہمان قیام کرتے۔ ان مہمانوں میں سپاہیانہ فنون کا مظاہرہ کرنے والے بھی ہوتے اور فنونِ لطیفہ کی نمائندگی کرنے والے بھی ـــــ ۱۸۷۹ء کے میلے میں نواب کلب علی خاں کے چھوٹے بھائی حیدر علی خاں کی دعوت پر کلکتے کی ایک ڈیرے دار ماہ منیر عرف منّی بائی بھی آئی۔ وہ شاعرہ بھی تھی اور حجاب تخلص کرتی تھی۔ اس کے زمانے میں شاعرات کے جو تذکرے مرتب ہوئے ان میں اس کا ذکر اور نمونۂ کلام موجود ہے۔ بعض نے اسے

عبدالغفور نسّاخ اور بعض نے نسّاخ کے شاگرد مولوی عصمت اللہ انسخ کی شاگرد لکھا ہے۔ اس نے اپنا دیوان بھی مرتب کر لیا تھا۔ میلے کی ایک محفل میں جس میں داغ بھی شریک تھے، حجاب نے داغ کی یہ غزل گائی :

ترے وعدے کو بُتِ حیلہ جو نہ قرار ہے نہ قیام ہے
کبھی شام ہے، کبھی صبح ہے، کبھی صبح ہے کبھی شام ہے

جب مقطعے تک پہنچی تو بار بار داغ کی طرف دیکھتی اور یہ مصرعہ دہراتی :

جسے داغ کہتے ہیں دوستو اسی روسیاہ کا نام ہے

نثار احمد فاروقی کے لفظوں میں "اس شوخی سے ساری محفل لوٹن کبوتر بن گئی اور خود داغ بھی ان اداؤں پر دل نچھاور کر بیٹھے۔" اس وقت داغ کی عمر تقریباً اکیاون سال تھی۔

مثنوی "فریادِ داغ" میں، جو ان کے اس معاشقے کی روداد سناتی ہے، داغ نے حجاب کے حسن و جمال کی لفظی تصویریوں اتاری ہے :

جٹّی جٹّی بھنوں کی وہ تحریر
کیوں نہ دل اس لکیر پر ہو فقیر
گات بانکی، بدن سڈول تمام
فتنہ قد، فتنہ چشم، فتنہ خرام
سج دھج آفت، غضب تراش خراش
کسی اچّھے کی دل ہی دل میں تلاش

(مصرعہ ثانی کہہ کر داغ نے خود کو اچھّوں میں شامل کر لیا ہے)

اب ذرا اس کے ناز و انداز ملاحظہ کیجیے :

گرتے گرتے کبھی سنبھل جانا
اِدھر آنا، اُدھر نکل جانا
کبھی کچھ تیوری پہ بل دینا
کبھی آنکھیں دکھا کے چل دینا

ہے نرالی ادا زمانے سے
روٹھنا اور بھی منانے سے
اِدھر اظہارِ درد و رنج فراق
اور اُدھر گفتگو تڑاق پڑاق

مثنوی "فریادِ داغ" ۸۳۸ اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ داغ نے سفر کلکتہ سے واپس آکر لکھی۔ "جلوۂ داغ" کے مطابق یہ "دو دن کی معمولی فکر کا نتیجہ ہے" ص ۱۱۴)

داغ کی زندگی میں اس مثنوی کے پانچ ایڈیشن ایک ہی مطبعے سے شائع ہوئے۔ کالی داس گپتا رضا ہمیں اطلاع دیتے ہیں کہ ان کے کتب خانے میں "فریادِ داغ" کا ایک قدیم نسخہ ہے جس کے خاتمۃ الطبع میں تحریر ہے :
"اگرچہ متقدمینِ دہلی کا اب اس عالمِ فانی میں وجود باقی نہ رہا مگر اب جو اہلِ کمال وہاں کے موجود ہیں ان میں سے جناب نواب مرزا خاں صاحب داغ دہلوی کی ذات مغتنمات سے سمجھی جاتی ہے...... مرزا صاحب نے یہ قیامت کی مثنوی تحریر فرمائی ہے...... فی الحال پانچویں بار مطبع مطلع العلوم و اخبار نیّر اعظم مراد آباد...... میں چھپ کر نذرِ شائقین ہوئی ہے۔" (جہاں استاد داغ دہلوی، ص ص ۲۲۔۱۲۱)

رضا صاحب نے حاشیے میں یہ بھی لکھا ہے : "داغ دہلوی کے بعد الگ سے ذرا اوپر کاتب نے باریک قلم سے "مرحوم" تحریر کر دیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ مثنوی کی کتابت پانچویں ایڈیشن کے لیے ہو چکی تھی کہ داغ کے انتقال کی خبر آئی۔ اس سے یہ بھی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ مثنوی پانچویں بار ۱۹۰۵ء میں چھپی جو داغ کا سالِ وفات ہے۔"

"فریادِ داغ" تاریخی نام ہے جس سے ۱۳۰۰ کے عدد برآمد ہوتے ہیں۔ گویا یہ مثنوی پہلی بار ۱۳۰۰ھ / ۱۸۸۳ء میں چھپی۔ داغ کے ایک خط سے جو حجاب کے نام ہے، پتا چلتا ہے کہ پہلا ایڈیشن بہت جلد ختم ہو گیا۔ داغ لکھتے ہیں :

"مثنوی تمھاری تھی، تمھارے حال کی تھی، تمھاری صفات کی تھی......
صاحبِ مطبع نے پندرہ سو کاپیاں چھاپی تھیں، مہینہ بھر میں فروخت
ہو گئیں، مکرر چھپیں گی......" (زبان داغ، ص ص ۹۰-۸۹)

داغ نے کلکتے کا پہلا سفر نواب کلب علی خاں کے ساتھ دسمبر ۱۸۶۶ء میں کیا تھا۔ منی بائی حجاب دو مرتبہ رامپور آئی اور اب اس کا اصرار تھا کہ اس سے ملنے داغ کلکتے پہنچیں۔ داغ اس تقاضے کو ٹال نہ سکے اور نواب رام پور سے اجازت لے کر کلکتے کے لیے چل پڑے۔ وہ اوائل اپریل ۱۸۸۲ء میں رامپور سے روانہ ہوئے اور اپریل کی آخری تاریخوں میں پٹنہ پہنچے جو کلکتے کے راستے میں پڑتا تھا۔ وہاں انھوں نے کئی ہفتے قیام کیا اور مشاعروں میں بھی شریک ہوئے۔ پہلے مشاعرے کا مصرعۂ طرح یہ تھا :

اُدھر آئینہ رکھا ہے اِدھر وہ تن کے بیٹھے ہیں

داغ نے اس مشاعرے میں طرحی غزل کے علاوہ ایک غیر طرحی غزل بھی پڑھی جس کا مطلع تھا :

فرقت کی شب یہ کام لیا دل کے داغ سے
ڈھونڈا اجل کو تا بہ سحر اس چراغ سے

اور مقطع تھا :

دنیا میں ایسے لوگ مصیبت زدہ، کہاں
روئے ہم آج خوب گلے مل کے داغ سے

یہ غزل ۱۵ شعروں پر مشتمل ہے اور داغ کے دوسرے دیوان "آفتابِ داغ" صفحہ نمبر ۶۵ پر درج ہے۔ دوسری غزل جو طرحی بھی تھی، بہت مشہور ہوئی، یہ ۱۶ شعر کی ہے اور "آفتاب داغ" کے ۴۳ ویں صفحے پر چھپی ہے۔ اس کے چند شعر یہ ہیں :

بھویں تنتی ہیں، خنجر ہاتھ میں ہے، تن کے بیٹھے ہیں
کسی سے آج بگڑی ہے کہ وہ یوں بن کے بیٹھے ہیں

فسوں ہے یا دعا ہے، یہ معما کھل نہیں سکتا
وہ کچھ پڑھتے ہوئے آگے مرے مدفن کے بیٹھے ہیں
یہ اٹھنا بیٹھنا محفل میں ان کا رنگ لائے گا
قیامت بن کے اٹھیں گے، بھبوکا بن کے بیٹھے ہیں
سبک ہو جائیں گے، گر جائیں گے وہ بزم دشمن میں
کہ جب تک گھر میں بیٹھے ہیں تو لاکھوں من کے بیٹھے ہیں

داغ چونکہ رئیس زادے تھے (رئیس زادہ ہے داغ آپ کا غلام نہیں) اس لیے سفر میں موسم کی سختی ان کے لیے ناقابل برداشت تھی، خواہ یہ سفر اس محبوبہ دلنواز کے لیے ہی ہو، جو انھیں جان و دل سے عزیز تھی۔ پٹنہ سے کلکتے کے لیے عازمِ سفر ہونے سے پہلے انھیں موسم کے سازگار ہو جانے کا انتظار تھا :

کوئی چھینٹا پڑے تو داغ کلکتے چلے جائیں
عظیم آباد میں ہم منتظر ساون کے بیٹھے ہیں

دوسرے مشاعرے میں انھوں نے جو غزل پڑھی اس کے بھی تین شعر ملاحظہ کریں :

طور کے پہلو میں اک بُت خانہ ایسا چاہیے
شور اٹھے، جلوۂ جاناں نہ ایسا چاہیے
دیکھ کر چاہت مری، کہتے ہیں سب اہلِ نظر
گل کو بلبل، شمع کو پروانہ ایسا چاہیے
خوب جی بھر کے سنا پہلے تو قصہ داغ کا
پھر کہا دل تھام کر: افسانہ ایسا چاہیے

داغ کی ہر طرف دھوم مچ گئی لیکن کچھ لوگ درپردہ ان کے مخالف بھی ہو گئے۔ ایک رئیس نے اپنے یہاں طرحی مشاعرہ رکھا لیکن داغ کو خبر نہ کی اور عین وقت پر شرکتِ مشاعرہ کی درخواست لے کر داغ کے پاس پہنچ گئے۔ مدعا یہ تھا کہ داغ طرح میں غزل

نہ کہہ سکیں اور انھیں ان کی قدرتِ کلام پر حرف زنی کا موقع مل جائے۔ داغ نے ان کی موجودگی ہی میں مطروحہ مصرعے پر ۲۶ شعر کی غزل کاتب کو لکھوادی۔ یہ غزل بھی "آفتابِ داغ" میں شامل ہے (ص ۷۳) اس غزل کا مقطع ہے :

کیوں پوچھتے ہو، کون ہے یہ، کس کی ہے شہرت
کیا تم نے کبھی داغ کا دیواں نہیں دیکھا

ممکن ہے مقطعے میں روئے سخن ان صاحب کی طرف ہی ہو جو امتحاناً عین وقت پر طرحی مشاعرے میں شرکت کی دعوت دینے چلے آئے تھے۔

داغ پٹنہ میں ایک مہینے سے بھی کچھ زیادہ مقیم رہے اور وسطِ ماہِ جون میں کلکتے کے لیے روانہ ہوئے لیکن "فریادِ داغ" کا ایک شعر ہے :

آٹھ دن سیر دیکھی پٹنے کی
یہ ہوئی وجہ جی اچٹنے کی

اکثر لوگوں نے اسے داغ کے سہو پر یا پھر غلط بیانی پر محمول کیا ہے لیکن کالی داس گپتا رضا کا کہنا ہے کہ یہاں آٹھ دن محاورتاً بہت دن کے معنی میں استعمال ہوا ہے جیسے آٹھ پہر یعنی دن رات۔ یہ توجیہ کچھ زیادہ قابلِ قبول نہیں۔

داغ کے لیے رامپور سے کلکتے تک کا سفر آسان نہ تھا۔ اس وقت تک ان کے مالی حالات بھی ایسے نہ تھے کہ وہ بہ سہولت یہ سفر کر سکیں اور پھر اس کے لیے لمبی چھٹی لینا بھی ضروری تھا۔ لیکن حجاب کے اصرار نے انھیں مجبور کر دیا۔ انھوں نے رخصت لی اور پہلے دلّی آئے جہاں ایک ساہوکار سے کچھ رقم قرض لی۔ دلّی سے وہ لکھنؤ پہنچے وہاں انجم نیشاپوری نے ان کی میزبانی کی۔ لکھنؤ سے داغ نے پٹنہ کا رخ کیا۔ وہاں ان کے سوتیلے بھائی آغا مرزا شاغل موجود تھے۔ وہ محلّہ گڑہٹہ میں رہتے تھے۔ داغ اولاً انھی کے یہاں ٹھہرے مگر ان کا مکان زیادہ گنجائش والا نہ تھا اور داغ کے پاس آنے جانے والوں کی بھیڑ لگ گئی اس لیے وہ کچھ دن بعد میر باقر (شاگرد وحید الٰہ آبادی، متوفی ۱۱ فروری ۱۹۲۷ء) کی حویلی میں منتقل ہوگئے۔

پٹنہ سے داغ کلکتے پہنچے تو وہاں بھی ان کا پُر جوش استقبال ہوا۔ "فریادِ داغ" میں کلکتے پہنچنے کے بعد کی کیفیت انھوں نے اس طرح بیان کی ہے :

شہر میں دھوم تھی کہ داغ آیا
داغ آیا تو باغ باغ آیا
خود بخود دل کھلا ہی جاتا تھا
قہقہہ لب پہ آہی جاتا تھا

موسم کی خوشگواری :

کالی کالی گھٹائیں آتی تھیں
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آتی تھیں

اختلاط و انبساط کی گھڑیاں :

چاندنی کے تمام شب جلسے
دلکشا سقف پر عجب جلسے
رات عیش و نشاط میں گزری
صبح تک اختلاط میں گزری

منّی بائی کی سکونت کولوٹولہ اسٹریٹ پر تھی۔ داغ نے ناخدا مسجد کے سامنے ایک بالا خانے پر قیام کیا جو پہلے ہی سے ان کے لیے حاصل کر لیا گیا تھا۔

داغ اور منّی بائی حجاب کا یہ معاشقہ بہت لمبا چلا۔ داغ افلاطونی عشق کے قائل نہیں تھے۔ ان کا محبوب تصوراتی نہیں تھا، وہ اس سے اپنے جسمانی تقاضوں کی تسکین اور تکمیل کے بھی طلبگار تھے اور ان تقاضوں کی تکمیل کے لیے وہ کہاں تک جا سکتے تھے اس کی گواہی ان کے اس طرح کے اشعار سے ملتی ہے :

حوروں کا انتظار کرے کون حشر تک
منّی کی بھی ملے تو روا ہے شباب میں

لیکن منّی بائی حجاب کو انھوں نے جس انداز سے چاہا، آخر تک اس سے نباہ کی جو کوشش کی اور عمر کی اس منزل میں بھی جہاں جسمانی تقاضوں میں شدّت باقی نہیں رہتی، جس والہانہ جذبے کے ساتھ حجاب کی قربت کے وہ متمنّی رہے، اس سے بہ آسانی یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہاں جسم پر دل غالب آگیا تھا۔

داغ کی کلکتے میں خوب خوب پذیرائی ہوئی۔ حجاب سے شبانہ روز ملاقاتوں کا لطف ایک طرف، دوسری طرف انھوں نے شہر کی ادبی محفلوں میں بھی دھوم مچادی۔ شہر کے رؤسا اور مٹیا برج میں مقیم لکھنؤ کے شاہی خاندان نے بھی ان کی خوب آؤ بھگت کی۔ وہ انھی رنگ رلیوں میں تھے کہ رامپور سے ان کی فوری طلبی ہوئی۔ وہ ۳ جولائی ۱۸۸۲ء کو کلکتے سے واپسی کے سفر پر روانہ ہوئے اور ۶ جولائی کو رامپور پہنچ گئے۔

❐

رامپور میں داغ کو امیرانہ ٹھاٹ باٹ چاہے میسر نہ آئے ہوں لیکن وہ زندگی آرام و اطمینان کے ساتھ ضرور بسر کر رہے تھے کہ ۲۳ مارچ ۱۸۸۷ء کو نواب کلب علی خاں کا انتقال ہو گیا۔ یہ داغ کے لیے بہت بڑا صدمہ تھا۔ ان کا دل رامپور سے اچاٹ ہو گیا۔ ان کی ایک غزل جوان کے تیسرے دیوان "مہتابِ داغ" میں شامل ہے، اس کے مقطعے میں انھوں نے اپنی اس ذہنی کیفیت کا اظہار کیا ہے :

رہے کیا مصطفےٰ آباد میں داغ
مزے سارے تھے وہ خلد آشیاں تک

'خلد آشیاں' سے نواب کلب علی خاں مرحوم مراد ہیں۔ کلب علی خاں کے جانشین نواب مشتاق علی خاں اور ان کے مدارالمہام اعظم الدین خاں کو شعر و سخن سے کوئی دلچسپی نہیں تھی بلکہ ان دونوں کا رویّہ اربابِ فکر و فن کے لیے خاصا توہین آمیز تھا۔ داغ کو ملازمت سے برخاست کیا گیا یا خود انھوں نے استعفیٰ دیا یہ امر تحقیق طلب ہے لیکن داغ تقریباً ۲۱ سال تک دربار رامپور کی ملازمت میں رہ کر ۲۸ دسمبر ۱۸۸۷ء کو رامپور سے دلّی چلے آئے۔ جس غزل کا مقطع اوپر درج ہوا اس کا یہ شعر بھی

داغ کی اسی ذہنی کیفیت کا غماز ہے جس سے رامپور سے رخصت ہوتے ہوئے وہ دو چار ہوئے ہوں گے :

کہوں کیا طالعِ واژوں کی تاثیر
گرا ہوں میں پہنچ کر آسماں تک

انھیں خبر نہیں تھی کہ ابھی اس سے آگے کی بلندیاں ان کی منتظر ہیں۔

والیِ دکن کے مشیرِ سخن

رامپور سے داغ سیدھے دلّی آئے اور کچھ دن یہیں مقیم رہے۔ پھر انھوں نے یکے بعد دیگرے کئی شہروں کا سفر کیا جہاں ان کے شاگردوں اور قدر شناسوں نے ان کی خوب مداراتیں کیں۔ قریبی مقامات امرتسر اور لاہور، جے پور، کشن گڑھ اور اجمیر شریف، متھرا، آگرہ اور علی گڑھ کے علاوہ انھوں نے بنگلور اور منگرول کا بھی رخ کیا اور وہاں بھی کچھ دن گزارے۔

داغ کے کئی قریبی شناسا اور ان کے مداح حیدر آباد دکن میں موجود تھے۔ ان میں نثار علی شہرت اور مولوی سیف الحق ادیب دہلوی بھی شامل تھے۔ ادیب، غالب کے شاگرد تھے اور حیدر آباد میں مترجم اخباراتِ سرکاری کے عہدے پر فائز تھے۔ ان دونوں کو خیال آیا کہ داغ کو حیدر آباد کیوں نہ بلوالیا جائے، وہ ان دنوں بیکار ہیں، یہاں شاید ان کے لیے کوئی کام نکل آئے۔ مولوی سیف الحق ادیب نے کچھ ارکانِ ریاست سے مشورہ کرنے کے بعد داغ کو لکھا کہ وہ حیدر آباد آئیں۔ داغ نے والیِ دکن میر محبوب علی خاں کی ادب نوازی اور علم پروری کے چرچے سنے تھے، وہ قدرے تامّل کے بعد حیدر آباد جانے کے لیے تیار ہوگئے۔ نثار علی شہرت اور سیف الحق ادیب کے علاوہ میر خانساماں ابراہیم علی بھی ان لوگوں میں تھے جنھوں نے داغ کو حیدر آباد آنے پر آمادہ کیا۔ داغ ۷ اپریل ۱۸۸۸ء کو حیدر آباد پہنچ گئے۔ مولوی سیف الحق ادیب

کا قیام بازار سعدی عنبر میں تھا۔ انھوں نے اپنے گھر کے قریب ہی ایک مکان داغ کے لیے کرائے پر لے لیا تھا، داغ اسی مکان میں ٹھہرے۔ ان کے حیدر آباد آنے کی خبر شہر میں عام ہوئی تو ان سے ملنے کے لیے آنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ آنے والوں میں عام لوگ بھی تھے اور رؤسائے شہر بھی لیکن داغ تو والیِ دکن میر محبوب علی خاں تک رسائی کی امید اور ارمان دل میں لیے ہوئے تھے۔ کب وہ بلائیں اور کب یہ ان کی خدمت میں حاضر ہوں۔ اس طرف سے کوئی سلسلہ جنبانی نہ ہونے پر خود داغ نے راجا گردھاری پرشاد عرف بنسی راجا کی معرفت جو خود بھی شاعر تھے، باقی تخلص کرتے تھے اور داغ کے مداح تھے، حضورِ شاہ میں حاضری کی درخواست پیش کی جسے فوری طور پر پذیرائی حاصل ہوئی اور داغ کو دربار میں بلایا گیا۔ داغ نے قصیدہ پڑھا، قصیدے کی ستائش تو خوب ہوئی لیکن صلہ کچھ نہیں ملا۔ داغ دربار سے خالی ہاتھ لوٹے۔

ایک سال سے زیادہ مدت گزر گئی لیکن داغ کی امید بر نہ آئی، داغ دلّی سے آتے ہوئے جو رقم ساتھ لائے تھے وہ دھیرے دھیرے ختم ہو گئی۔ ملازمت کا کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا۔ آخر داغ نے واپسی کا فیصلہ کیا۔ ۱۲ جولائی ۱۸۸۹ء کو انھوں نے حیدر آباد کو خیر باد کہا اور بنگلور اور بمبئی ہوتے ہوئے دلّی پہنچ گئے۔ داغ نے حیدر آباد جاتے ہوئے کچھ رقم تو ایک مکان رہن رکھ کر حاصل کی تھی اور کچھ قرض لی تھی۔ چھ ہزار روپے (جو اس زمانے میں ایک بڑی رقم تھی) داغ کے قیامِ حیدر آباد کے سال سوا سال کے عرصے میں خرچ ہو گئے۔ آمد و رفت کے مصارف اس پر مستزاد۔

اُدھر میر محبوب علی خاں کو جب معلوم ہوا کہ داغ دیارِ دکن سے ناامید ہو کر دلّی واپس چلے گئے ہیں تو انھوں نے وقار الامرا سے داغ کو خط لکھوایا جس میں ان سے دوبارہ حیدر آباد آنے کو کہا گیا۔ داغ نے اس بار مصارفِ سفر اور ملازمت ملنے تک قیامِ حیدر آباد کے اخراجات کے لیے اپنا ایک مکان فروخت کر دیا۔ وہ ۲۹ مارچ ۱۸۹۰ء کو دلّی سے روانہ ہو کر ۳ یا ۴ اپریل کو تازہ توقعات لیے واردِ حیدر آباد ہوئے۔ اس مرتبہ وہ محبوب گنج محلے میں کمان کے قریب واقع ایک مکان میں ٹھہرے۔ یہ مکان مولوی ظہور علی وکیل کے گھر کے قریب واقع تھا۔ یہ مکان زیادہ کشادہ نہیں تھا۔ چند

برسوں بعد جب داغ والیِ دکن کے مشیرِ سخن مقرر ہو چکے تھے، انھوں نے اس مکان کی سکونت ترک کر دی اور ترپ بازار کی ایک شاندار کوٹھی میں منتقل ہو گئے۔

حیدر آباد سے متوسل ہونے کی داستان خود داغ اس طرح بیان کرتے ہیں:

"......یہاں پہنچ کر پھر ایک برس گزر گیا اور کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ میرا دل پھر اچاٹ ہوا، پھر اعلیٰ حضرت کے بعض مصاحبین کی خدمات میں معروضات پیش کیے اور کہا کہ میں جاتا ہوں۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ میں اپنے مکان کے برآمدے میں بیٹھا تھا کہ میرے سامنے سے اعلیٰ حضرت کی سواری نکلی۔ صدر میں اعلیٰ حضرت جلوہ فرما تھے۔ بائیں میں دو صاحب تھے۔ جس وقت میرے مکان کے قریب سواری پہنچی، میں جیسا کہ یہاں کا دستور ہے تعظیم کے لیے کھڑا ہو گیا اور سلام کیا۔ شاید اعلیٰ حضرت نے سلام لیا ہو، یہ میں نہیں دیکھ سکا۔ دوسرے دن معلوم ہوا کہ اعلیٰ حضرت نے فرمایا کہ داغ کیوں جاتے ہیں۔ دس پندرہ روز کے بعد معلوم ہوا کہ چار سو روپے کا منصب اعلیٰ حضرت نے میرے واسطے مقرر فرمایا ہے۔ یہ خبر عام طور سے مشہور ہو گئی۔ لوگ مجھے مبارکباد دینے کے لیے آنے لگے۔ میں نے جب اعلیٰ حضرت کے بعض مقربین سے دریافت کیا تو انھوں نے اس امر کی تصدیق کی، لیکن اس واقعے کو بھی ایک سال گزر گیا اور ہنوز دلی دور است کے مصداق کچھ نہیں۔ ایک دفعہ میں وقار الامرا سے ملنے کے لیے گیا۔ انھوں نے اعلیٰ حضرت کی ڈیوڑھی میں ہی مجھے بلا لیا۔ میں وہاں ایک گاڑی پر پہنچا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ سرکاری گھوڑے دوڑ رہے ہیں۔ گاڑی کو ایک طرف کھڑا کر کے میں ان کا انتظار کرنے لگا، اتفاق دیکھیے، ٹہلتے ٹہلتے اعلیٰ حضرت بھی ادھر نکل آئے، میری گاڑی کھڑی دیکھ کر پوچھا کہ یہ کس کی گاڑی ہے۔ جب انھیں بتایا گیا کہ یہ گاڑی داغ کی ہے تو پوچھا، کہاں ہیں؟ اعلیٰ حضرت کو جب وہ مقام

بتایا گیا، جہاں میں کھڑا تھا تو وہ اس طرف بڑھے۔ گھوڑے پر سوار تھے۔ میں اعلیٰ حضرت کو اپنی طرف آتا دیکھ کر چھپا، مگر اعلیٰ حضرت بالکل ہی سامنے آگئے تو سلام کیا اور ایک اشرفی اور کچھ روپے، جو اس وقت میری جیب میں تھے نذر گزرانے، اعلیٰ حضرت نے مجھے ساتھ آنے کا اشارہ فرمایا اور میں ان کے ساتھ ہولیا۔ اِدھر اُدھر کی دو چار باتوں کے بعد کلام سنانے کا حکم ہوا۔ میں نے اپنی یہ غزل سنائی :

دیکھے منصور اگر آج زمانا تیرا
ہو اناالحق کی جگہ لب پہ ترانا تیرا
داغ ہر ایک زباں پر ہو فسانا تیرا
وہ دن آتے ہیں، وہ آتا ہے زمانا تیرا

مرزا صاحب نے فرمایا کہ جب میں نے یہ دوسرا مطلع پڑھا تو اعلیٰ حضرت نے زبان مبارک سے فرمایا "اس میں کیا شک ہے" جس وقت ان کی زبان سے میں نے یہ الفاظ سنے کچھ یقین سا ہو گیا کہ میں نوکر ہو گیا، اسی غزل کا ایک شعر ہے :

مدعی دیکھ ہمیں چشمِ حقارت سے نہ دیکھ
کل ہمارا تھا، جو ہے آج زمانا تیرا

مرزا صاحب بولے کہ میں نے یہ شعر بہت زور دے کر پڑھا۔ اعلیٰ حضرت بہت متاثر ہوئے اور دو دفعہ مجھ سے یہ شعر پڑھوایا، اس کے بعد میں نے یہ شعر پڑھا :

ترکِ عادت سے مجھے نیند نہیں آنے کی
کہیں نیچا نہ ہو اے گور سرھانا تیرا

میرے اس شعر کے پڑھتے ہی تمام فضا افسردہ ہو گئی، اعلیٰ حضرت بھی متاثر تھے، لیکن شاہی محل میں اس طرح کی افسردگی بھی مجھے گوارا نہ تھی، فوراً دوسری یہ غزل شروع کر دی :

کس وجہ سے لب پر مرے فریاد نہ آتی
وہ چوٹ نہیں کھائی تھی، جو یاد نہ آتی

(بزم داغ ص ص ۷۵۔۷۴)

داغ کی ملازمت کے سلسلے میں اس کے بعد بھی کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔
ان پر پھر مایوسی غالب آنے لگی تھی کہ اچانک ۶ فروری ۱۸۹۱ء کی رات کو نو بجے ایک چوبدار آیا اور اس نے ایک سر بمہر لفافہ داغ کو دیا اور دربار میں حاضری کا حکم بھی سنایا۔ داغ نے لفافہ کھولا تو اس میں بہ غرضِ اصلاح نظام کی غزل تھی۔ داغ نے اسی وقت اصلاح کر کے سر بہ مہر لفافے ہی میں غزل واپس کر دی اور صبح دربار میں حاضر ہو کر نذر پیش کی۔ ۴ اکتوبر ۱۸۹۱ء کو چار سو پچاس روپے ماہانہ وظیفہ ابتدائے ورودِ حیدر آباد سے منظور ہوا۔ تین برس تک یہی وظیفہ ملتا رہا، پھر اسے بڑھا کر ایک ہزار روپے ماہانہ کر دیا گیا اور یہ بھی ابتدائے ورودِ حیدر آباد سے محسوب ہوا، وقتاً فوقتاً قیمتی تحائف بھی ملتے رہتے تھے۔ داغ کو یہ توقع بھی تھی کہ نظام انھیں رہنے کے لیے کوئی کوٹھی بھی مرحمت کریں گے۔ ایک مقطعے میں کہتے ہیں :

حضور دیں گے تمھیں چند روز میں اے داغ
اٹھاؤ اور کوئی دن مکان کی تکلیف

مگر یہ توقع پوری نہیں ہوئی۔ اس توقع میں خود انھوں نے بھی اپنے لیے مکان نہیں خریدا اور آخر تک اسی کرائے کی کوٹھی میں رہتے رہے جو ترپ بازار میں واقع تھی۔
والیِ دکن نے بلبلِ ہندوستاں، جہاں استاذ، دبیر الدولہ، ناظم یار جنگ، نواب فصیح الملک بہادر کے خطابات سے بھی نوازا۔ داغ ان خطابات میں سے خود صرف فصیح الملک کا خطاب اپنے نام کے ساتھ لکھنے لگے تھے۔ داغ کا ایک اور مقطع ہے :

تم نمک خوار ہوئے شاہِ دکن کے اے داغ
اب خدا چاہے تو منصب بھی ہو جاگیر بھی ہو

آصفِ سادس میر محبوب علی خاں نے داغ کی یہ آرزو بھی پوری کی اور انھیں ایک گاؤں عنایت فرمایا جسے حیدر آباد کی اصطلاح میں مقطعے سے موسوم کیا جاتا تھا۔ داغ کو ایک باغ بھی مرحمت ہوا تھا اور منصب چہار ہزاری بھی۔
داغ کی جو قدر افزائی میر محبوب علی خاں نے کی وہ بے مثال کہی جا سکتی ہے۔
داغ شاہی عملے کے ارکان میں تھے اور دربار میں انھیں باعزت مقام حاصل تھا۔ شاہی

مسند کے قریب چند خاص امرا اور عہدیداران کو نشست کی اجازت تھی۔ انھی میں داغ بھی تھے۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر کا بیان ہے کہ جب آصفی دربار میں ریزیڈنٹ آتا تو کرسیاں بچھادی جاتیں جن کی دو صفیں ہوتیں۔ وسط میں نظام اور ریزیڈنٹ بیٹھتے اور دوسری طرف ریاست کی دوسری سربرآوردہ شخصیتیں، داغ کو یہیں جگہ دی جاتی۔ سیر و شکار میں بھی داغ نظام کے ساتھ رہتے۔ داغ نے سرزمینِ دکن اور اہلِ دکن کو اپنے بہت سے اشعار میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ ان میں سے چند یہ ہیں :

دلّی میں پھول والوں کی ہے ایک سیر داغ
بلدے میں ہم نے دیکھ لی سارے جہاں کی سیر

شہر ہے گلزار یوں، خلق ہے گلرنگ یوں
جیسے چمن در چمن باغ میں پھولے گلاب

کھل جائیں آنکھیں دیکھتے ہی اس چمن کے پھول
رضواں کو ہم دکھائیں جو باغِ دکن کے پھول

شیوۂ راستی ایسا ہے دکن میں اے داغ
بل نہیں رکھتے مسلمان سے ہندو دل میں

نہیں حیدرآباد پیرس سے کچھ کم
یہاں بھی سجے ہیں مکاں کیسے کیسے

داغ حیدرآباد اکیلے گئے تھے لیکن جب ۶ فروری ۱۸۹۱ء کو وہ ملازمِ سرکار ہوگئے تو انھوں نے اپنی بیوی فاطمہ بیگم کو بھی حیدرآباد بلالیا۔ فاطمہ بیگم نومبر یا دسمبر کے مہینے میں حیدرآباد پہنچیں۔ داغ شاہدانِ بازاری سے اپنے بے پناہ شغف کے باوجود بیوی سے محبت کرتے تھے۔ داغ کے اس کروفر کے زمانے میں وہ تقریباً ساڑھے سات

سال داغ کے ساتھ رہیں اور دسمبر ۱۸۹۸ء میں ان کا انتقال ہو گیا جس کا داغ نے ہفتوں سوگ منایا۔ امیر مینائی کے تعزیت نامے کے جواب میں انھوں نے ۱۴ شعبان ۱۳۱۶ھ کو جو خط لکھا تھا اس سے ان کے غم کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

داغ جب رامپور میں تھے تو امیر اور جلال سے ان کے بڑے قریبی مراسم قائم ہو گئے تھے۔ دکن کی عیش و عشرت کی زندگی میں بھی وہ انھیں فراموش نہ کر سکے۔ ایک غزل کے مقطعے میں کہتے ہیں :

اے داغ! ہے دکن سے بہت دور لکھنؤ
ملتے امیر احمد و سید جلال سے

امیر مینائی کو تو انھوں نے حیدر آباد بلوایا بھی، وہ اپنے اثر و رسوخ سے ان کے شایانِ شان کوئی منصب انھیں دلوانا چاہتے تھے مگر امیر کی زندگی نے وفا نہ کی۔ وہ ۵ ستمبر ۱۹۰۰ء کو حیدر آباد پہنچے اور ۱۴ اکتوبر ۱۹۰۰ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ امیر کی وفات پر داغ نے ۳ تاریخی قطعے کہے۔ پہلا قطعہ طویل ہے جس میں داغ نے امیر کے علم و فضل اور ان کے ساتھ اپنے تعلق خاطر کا ذکر کیا ہے۔ تاریخی شعر یہ ہے :

ہے دعا بھی داغ کی، تاریخ بھی
قصرِ عالی پائے جنت میں امیر

۱۳۱۸ھ

دوسرا قطعہ بہت مشہور ہوا :

کر گئے رحلت امیر احمد امیر
اب نشاطِ زندگی جاتا رہا
مل گئی تاریخ دل سے داغ کے
آہ لطفِ شاعری جاتا رہا

۱۳۱۷+۱=۱۳۱۸

آخری مصرعے سے ۱۳۱۷ برآمد ہوتے ہیں، داغ کا دل کنایہ ہے الف کے لیے جس

کا ایک عدد شامل کرنے سے مطلوبہ ۱۳۱۸ عدد پورے ہو جاتے ہیں ـــــ داغ نے اور بھی بہت سی تاریخیں کہی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس فن پر بھی عبور رکھتے تھے۔

○

یکم جنوری ۱۹۰۳ء کو وائسرائے ہند لارڈ کرزن نے ایڈورڈ ہفتم کی تخت نشینی کی خوشی میں دہلی میں ایک عظیم الشان دربار منعقد کیا۔ تمام والیانِ ریاست مدعو تھے۔ نظام بھی اس دربار میں شریک ہوئے اور جو چند عمائدینِ سلطنت ان کے ہمرکاب تھے، ان میں داغ بھی تھے۔ حیدر آباد کی ملازمت کے بعد داغ کا یہ پہلا سفر دلّی تھا جو آخری بھی ثابت ہوا۔ وہ جب تک جشنِ تاج پوشی کی تقریبات کے سلسلے میں دلّی میں مقیم رہے، اپنے پرانے دوستوں، مداحوں، شاگردوں اور عزیز و اقارب سے ملتے رہے اور ان کی ملاقاتوں سے لطف اٹھاتے رہے۔ ان سے ملاقات کرنے والوں میں سید وحید الدین بیخود دہلوی، جو بعد کو ان کے جانشین کہلائے اور مولوی عبدالرزاق کانپوری بھی تھے۔ دونوں نے ان ملاقاتوں کا حال قلمبند کیا تھا۔ بیخود کا مضمون بہ عنوان "داغ کی شخصیت" رسالہ "ساقی" دہلی (ایڈیٹر شاہد احمد دہلوی) کے مارچ ۱۹۴۰ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا، مولوی عبدالرزاق کانپوری (مصنف البرامکہ) کا مضمون "دہلی دربار" ان کے مجموعہ مضامین "یادِ ایام" (مطبوعہ ۱۹۴۶ء) کے حوالے سے تمکین کاظمی نے اپنی کتاب "نواب مرزا خاں داغ" میں شامل کیا ہے۔ بقول کالی داس گپتا رضا "ان تحریروں میں دہلی دربار ہی کے تعلق سے نہیں، داغ کے عادات و اطوار کے تعلق سے بھی اچھا مواد موجود ہے۔" دونوں مضامین کے کچھ اہم اقتباسات یہاں درج کیے جاتے ہیں :

پہلے بیخود دہلوی کے مضمون سے :

> شام کا وقت ہے۔ دربار کا موقع ہے۔ اعلیٰ حضرت حضور نظام کا کیمپ دلّی کلب میں رونق افروز ہے۔ ایک خیمہ داغ صاحب کو ملا ہوا ہے۔ میں حاضر خدمت ہوں۔ رمضان المبارک کا مہینہ۔ افطار کا انتظام۔

استاد خود افطاری تیار کرا رہے ہیں۔ گو روزے سے نہیں ہیں لیکن ثواب میں ہاتھ بٹانا چاہتے ہیں۔ میں نے دست بستہ عرض کی کہ "گھر جاکر روزہ کھول لوں گا۔ آپ کیوں تکلیف فرما رہے ہیں؟" ارشاد ہوا ـــــ "ارے سیّد تجھ کو تیرے نانا بخشوالیں گے مجھ کو بھی تو کچھ ثواب کما لینے دے۔"

باتیں کرتے کرتے کہنے لگے۔ "بیخود! یار ہماری طبیعت تو کند ہوئی جارہی ہے۔"

میں نے کہا۔ "استاد کیا فرما رہے ہیں آپ۔ آپ کی طبیعت اور کند۔ یہ تو خنجر براں، تیغِ آبدار ہے۔ اس کو زنگ اور کثافت سے کیا کام۔"

بولے "تو تو جانتا ہے۔ حسینوں کو دیکھتا ہوں اور خوبصورت شعر کہتا ہوں۔ یہ ٹھہرا کیمپ کا معاملہ۔ یہاں پریوں کے پر جلتے ہیں اور ہاں میاں بیخود ایک دفعہ تم نے ہرن کے کباب کھلائے تھے۔ وہ اس مزے کی چاٹ تھی کہ آج تک ہونٹ چاٹتا ہوں۔ حیدر آباد میں ہرن دیکھنے کو نہیں ملتا۔ اس کے گوشت کو جی ترستا ہے۔ ایک دفعہ تو بیٹا پھر ویسے ہی کباب کھلادے۔ خدا کرے تیری طبعِ شوخ و شنگ میدانِ سخن میں ہرن کی طرح چوکڑیاں بھرے۔"

میں نے کہا "بہت بہتر، ایک دو روز میں حاضر کروں گا۔" پھر بڑی دیر تک صحبت آراستہ رہی۔ کس مزے کی باتیں تھیں اور کیا لطفِ صحبت تھا :

دلِ من داند و من دانم و داند دلِ من

رات گئے میں واپس آیا۔ صبح جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ دروازے پر آدمی نے آواز دی۔ معلوم ہوا استاد نے پرچہ بھیجا ہے۔ کھول کر پڑھا تو صرف یہ مصرعہ درج تھا :

نہیں ملتی یہاں ہرنی ترستا ہوں کبابوں کو

میں ہرنی کا مطلب بھی سمجھ گیا اور کبابوں کا مدعا بھی۔ استاد کو آہو چشموں سے کچھ اس بلا کا عشق تھا کہ ان کی مفارقت سے وحشت ہوتی تھی اور ان کی موانست سے طبعِ چابک دست چوکڑیاں بھرنے لگتی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ یہ ضیغمِ میدانِ سخنوری گو عمر میں بڈّھا ہو گیا تھا لیکن طبعِ جواں رکھتا تھا۔ جس وقت میں پہنچا استاد نے خضاب باندھ رکھا تھا۔ فربہ اندام، دراز قامت، چوڑی ہڈّی، بھرا ہوا چہرہ، بڑی بڑی شوخ آنکھیں :

آنکھ میں شوخی کس بلا کی تھی

کچھ کہا نہیں جاتا۔ نگاہ قیامت کی فتنہ زا جو سینے کے پار ہو۔ دل میں گھر کرے۔ غرضکہ داغ صاحب عجب سج دھج کے بیٹھے تھے

جاڑے کا موسم تھا۔ تمام چیزیں ٹھنڈی ہو گئی تھیں۔ میں نے عرض کیا۔ "کھانا نوش فرمانے سے آدھ گھنٹے پہلے فرما دیجیے گا تاکہ کھانا گرم ہو جائے۔" فرمایا۔ "وقت ہو گیا ہے، خضاب دھو کر کھانا کھاؤں گا۔" آدمی کو بلا کر کہا۔ "دیکھو محبوب یار جنگ صاحب سے میرا سلام کہو اور کہنا آپ نے کھانا نہ کھایا ہو تو میرے ساتھ کھائیے۔" اس عرصے میں مَیں نے رکاب دار کو حکم دیا کہ کھانا گرم کرے اور اس نے دہی اور مکھن لگا کر سیخیں سینکنی شروع کیں۔ داغ صاحب نہایت سیر خور اور خوش خوراک تھے۔ کھانا کھاتے تھے اور مزے لے لے کر کھاتے تھے۔

بُلبُل صحنِ باغ سے اور شاگرد استاد سے دور زیادہ عرصے نہیں رہ سکتا۔ میں دلّی میں تھا اور استاد حیدر آباد میں۔

اعلیٰ حضرت حضور نظام نے استاد کی تنخواہ میں اضافہ فرمایا یہ

واقعہ بھی قصہ طلب ہے۔ حضرت داغ نے برسر دربار غزل گزرانی۔ مقطع تھا:

تم نمک خوار ہوئے شاہِ دکن کے اے داغ
اب خدا چاہے تو منصب بھی ہو جاگیر بھی ہو

وہاں کیا کمی تھی اور کیا دیر۔ حکم ہوا اور ترقی ہو گئی۔ مجھے اطلاع ہوئی۔ مبارکباد بذریعہ خط پیش کی۔ جواب آیا دور کی مبارکباد ہم قبول نہیں کرتے......

ہم کو تو بہانہ درکار تھا۔ مجنوں را ہوئے بس است۔ داغ صاحب میرے استاد تو تھے ہی لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں عاشق تھا اور وہ معشوق۔ وہ شمع تھے میں پروانہ۔ اِدھر پروانہ ملا اُدھر میں روانہ ہوا۔

حیدر آباد میں ایک روز شام کے وقت میں استاد صاحب کے پاس بیٹھا تھا۔ وہ شعر کہہ رہے تھے میں لکھتا جاتا تھا۔ ایک صاحب تشریف لائے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد استاد کی زود گوئی کا ذکر آیا۔ ان صاحب نے دریافت کیا۔ استاد آپ ایسے جلدی شعر کیونکر کہہ لیتے ہیں؟ استاد نے کہا اور جناب کیونکر کہتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا۔ "حقہ لے کر پلنگ پر لیٹتا ہوں، کروٹیں بدلتا ہوں، کبھی اٹھتا ہوں، کبھی بیٹھتا ہوں، طبیعت پر زور ڈالتا ہوں، جب بڑی مشکل سے ایک شعر بنتا ہے۔" داغ صاحب نے مسکرا کر فرمایا۔ "معاف کیجیے گا۔ آپ شعر کہتے نہیں شعر جنتے ہیں۔"

سچ یہ ہے کہ غضب کی بذلہ سنج اور شوخ طبیعت پائی تھی۔ ایک لطیفہ کیا ہزاروں موجود ہیں۔ نمونتہً چند مشتے از خروارے پیش کیے دیتا ہوں۔ ایک دن حضرت نماز پڑھ رہے تھے۔ ایک شاگرد آئے، ان کو نماز میں مشغول دیکھ کر واپس چلے گئے۔ اسی وقت داغ صاحب نماز سے فارغ ہوئے۔ نوکر نے کہا فلاں صاحب آئے تھے۔ فرمایا "دوڑ کر

بلالا۔" جب وہ آئے تو داغ صاحب نے فرمایا۔ "حضرت آپ آکر واپس کیوں چلے گئے" کہا۔ "آپ نماز پڑھ رہے تھے۔" فرمایا۔ "حضرت میں نماز پڑھ رہا تھا لاحول تو نہیں پڑھ رہا تھا جو آپ بھاگے۔"

اور سنیے : ایک مرتبہ رامپور میں نواب کلب علی خاں صاحب مرحوم کے سامنے لفظ سانس پر بحث چھڑ گئی اس لیے کہ دلّی والے سانس کو مذکر لکھتے ہیں اور لکھنؤ والے مؤنث۔ لکھنؤ اور دلّی کے شعرا موجود تھے۔ ان میں امیر مینائی اور داغ صاحب بھی تھے۔ لیکن استاد بحث کے دوران میں خاموش بیٹھے رہے۔ آخر جب بحث کو طول ہوا اور کوئی فیصلہ نہ ہو سکا تو نواب صاحب نے فرمایا۔ "داغ صاحب آپ بھی تو کچھ فرمایئے۔" استاد نے کہا۔ "حضور، میرا فیصلہ تو یہ ہے کہ مؤنث کا سانس مؤنث اور مذکر کا مذکر سمجھا جائے۔" سب لوگ ہنس کر چپ ہو رہے۔

جن لوگوں نے حضرت داغ کو دیکھا ہے اور اس زمانے کے مشاعروں میں شرکت کی ہے، اس وقت کی محفلوں کو یاد کرتے ہیں اور روتے ہیں۔ آہ مجھے بھی جب وہ زمانہ یاد آتا ہے تو گھنٹوں خون کے آنسو رلاتا ہے۔ ان کی وہ شیریں کلامی، وہ بذلہ سنجی، وہ فقروں میں لطافت و ظرافت، وہ بات بات میں پھڑکا دینے والے لطیفے، وہ شستہ اور ٹکسال میں ڈھلے ہوئے الفاظ، وہ چست فقرے، گفتگو کے وقت یہ معلوم ہوتا تھا گویا علم کا دریا ہے کہ زور شور سے بہتا چلا جاتا ہے۔ افسوس وہ اردو کا مایۂ ناز شاعر دنیا میں نہ رہا جس کو یہ دعویٰ تھا اور صحیح دعویٰ تھا :

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

کلام کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ جو غزل رات کو مشاعرے میں پڑھتے تھے، صبح کو کوچہ و بازار میں لوگوں کی زبان پر ہوتی تھی۔ اکثر آدمی داغ صاحب کی عام مقبولیت پر حسد کرتے تھے۔ حاسدوں میں ایک بڑے شاعر بھی تھے۔ انھوں نے ایک دن داغ صاحب کو سرِ راہ ٹوک کر کہا۔ ''حضرت آج میرا آپ کا فیصلہ ہو جائے۔ فرمایئے، میں اچھا شعر کہتا ہوں یا آپ؟''

داغ صاحب نے فرمایا۔ ''حضرت شعر تو آپ ہی اچھا کہتے ہیں لیکن اس کا کیا علاج کروں کہ لوگ میرے ہی اشعار پسند کرتے ہیں۔''

جسم قدرت نے ایسا بنایا تھا کہ ہر لباس زیب دیتا تھا۔ ٹوپی اس وضع کی پہنتے تھے جیسی لوہار والے پہنتے ہیں۔ جسم پر کرتا، اس پر نیچی چولی کا انگرکھا، سیدھی تراش کا پاجامہ، پاؤں میں ڈیڑھ حاشیہ سلیم شاہی جوتی۔ دلّی میں قدیم شرفا کی یہی وضع تھی۔ یہ لباس قیام رامپور تک رہا۔ حیدر آباد جاکر حیدر آبادی اچکن یا شیروانی، انگریزی جوتا اور منصبی پگڑی استعمال کرتے تھے۔ یہ لباس بھی خوب زیب دیتا تھا۔ حقّے کا شوق تھا۔ پیچوان پیتے تھے اور چلم کسی وقت ٹھنڈی نہ ہوتی تھی۔ شطرنج، چوسر، گنجفہ خوب کھیلتے تھے۔ گنجفے میں داغ صاحب کو کبھی میں نے چکمہ کھاتے نہیں دیکھا۔ غضب کی یاد تھی۔ علم موسیقی میں بھی خوب ماہر تھے۔ ستار اچھا بجاتے تھے۔ خوش الحان تھے۔ آواز میں بے انتہا درد تھا۔

مشاعرے میں ہمیشہ تحت اللفظ غزل پڑھتے تھے۔ فصاحت زبان کی بلائیں لیتی تھی۔ الفاظ موتیوں کی طرح ڈھلتے چلے جاتے تھے۔ شعر اس خوبی سے ادا کرتے تھے کہ سننے والے کے سامنے نقشہ کھنچ جاتا تھا۔ میں نے ان سے بہتر غزل پڑھتے کسی کو دیکھا نہ سنا۔ ان

کے سامنے کبھی کسی کی غزل کامیاب نہ ہوتی تھی۔ اخیر عمر میں مشاعرے میں خود غزل پڑھنی چھوڑ دی تھی، کسی اور سے پڑھوا دیتے تھے۔

طبیعت میں نفاست تھی۔ عطر سے بہت شوق تھا۔ ظہر کے وقت بیسن مل کر اوپر کا جسم دھلتا تھا۔ پھر سارے جسم پر عطر ملا جاتا تھا۔ اس کے بعد ظہر کی نماز پڑھتے تھے۔ ایک کرتا پاجامہ روز بدلا جاتا تھا۔

نہایت خلیق، ملنسار، مہذب اور شائستہ تھے۔ حتیٰ کہ شاگردوں سے بھی آپ اور جناب کہہ کر بات کرتے تھے۔ کسی قدر زود رنج اور نازک مزاج تھے لیکن بہت کم غصہ آتا تھا اور تھوڑی سی معذرت پر فوراً صاف ہو جاتے تھے۔ دوستوں کی تکلیف سے بے چین اور ان کی خوشی سے خوش ہوتے تھے۔

○

اب مولوی عبدالرزاق کانپوری کے مضمون سے اقتباس :

دلّی میں حضور نظام کی کوٹھی شہر سے الگ تھی اور کئی ہزار گز افتادہ رقبہ کوٹھی سے متعلق تھا جس میں امرائے دولت کے سیکڑوں خیمے اور بارگاہیں تھیں، صدر پھاٹک پر ملٹری سپاہیوں کا پہرہ تھا اور ایک کمرے میں پولس آفیسر جمع تھے۔ ملاقات کا انتظام جس افسر کے سپرد تھا وہ ایک عرب تھا، جب میں نے مرزا داغ سے ملاقات کی تحریک کی تو اس نے ورقہ (ملاقات کا کارڈ) طلب کیا چنانچہ چند کارڈ پیش کیے گئے اور جواب کے انتظار میں ٹھہرے رہے۔ ایک گھنٹے کے بعد مرزا صاحب کا چوبدار آیا اور ان کی ذاتی ذمہ داری پر کیمپ میں جانے کی اجازت ہوئی۔

راستے میں صدہا خیمے نظر آئے جو ایک سے بڑھ کر ایک

شاندار تھے، ہر خیمے کے دروازے پر شوخ زرد رنگ کی تختی پر سیاہ حروف میں صاحبِ خیمہ کا نام لکھا ہوا تھا۔ ۳۵ منٹ کے بعد نواب فصیح الملک مرزا داغ کا نام نظر آیا۔ ان بارگاہوں کے قریب ہی کوٹھی تھی جس میں حضور نظام خوابِ راحت میں تھے، میرے بوٹ کی چرچر کی آواز آرہی تھی، ایک پہرے دار دوڑتا ہوا آیا اور شریفانہ انداز میں فہمائش کی کہ آہستہ چلیے حضور آرام میں ہیں۔ بوٹ کی آواز کسی طرح خواب گاہ میں نہیں جاسکتی تھی تاہم حکم کی بسر و چشم تعمیل کی گئی۔ اس وقت مجھے صائب کا یہ شعر یاد آیا اور منشی رحمت اللہ رعد کو مخاطب کر کے یہ شعر پڑھا :

اے صبا بر برگ ہائے غنچہ نہ آہستہ پا
پاسبانانند گلہا صائبا خوابیدہ است

میرے دوست نے برجستہ یہ شعر پڑھا:

سرھانے میر کے آہستہ بولو
ابھی تک روتے روتے سو گیا ہے

میں نے جواباً کہا :

سودا کے جو بالیں پہ گیا شورِ قیامت
خدّام ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے

اَلْحَمْدُ لِلّٰہ منزل ختم ہوئی اور داغ کی بارگاہ تک پہنچ گئے۔ صدر دروازے پر ایک چوبدار نے جس کی زرد مخملی وردی پر طلائی و نقرئی کام تھا، چِک اٹھائی اور ہم لوگ اندر داخل ہوئے۔ پہلے گول کمرے میں بٹھائے گئے جس میں ایرانی قالین کا فرش تھا، کرسیاں سیاہ رنگ کی تھیں۔ چند منٹ بعد طلبی ہوئی۔ دو درجے طے کر کے تیسرے درجے میں پہنچے تو یہ دیکھا کہ ایک قوی الجثہ شخص خیمے کی چوب تھام کر ہمارے استقبال کو اٹھ رہا ہے کیونکہ چلنے سے معذور ہے اور

پنڈلیوں پر گرم اونی پٹیاں بندھی ہوئی ہیں۔ درد (عرق النسا) میں مبتلا تھے۔ بارگاہ کا یہ حصہ نہایت آراستہ تھا، ایک جانب چاندی کا پلنگ بچھا تھا، وسط میں قیمتی ایرانی قالین تھا اور وسط سے ذرا ہٹ کر چاندی کی ایک بڑی انگیٹھی میں آگ بھڑک رہی تھی۔

مرزا صاحب نے کھڑے کھڑے مصافحہ کیا پھر ہمارے اصرار پر بیٹھ گئے۔ کارڈ سے نام تو پہلے معلوم ہو چکے تھے اب نام بنام تعارف ہوا اور بیٹھتے ہی میری جانب پیچوان بڑھایا اور ارشاد فرمایا "شغل فرمایئے۔" میں نے عرض کیا "پیر و مرشد! خدا نے اس آگ سے مجھے اب تک محفوظ رکھا ہے" فرمایا "اس کا نعم البدل بھی موجود ہے، اجازت ہو تو ایک جام پیش کیا جائے۔" اس لطیفے پر خوب ہنسی ہوئی اور یہ محض شاعرانہ مذاق تھا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ داغ اخیر عمر تک زندہ دل تھے۔

میری کتاب البرامکہ ۱۸۹۶ء میں شائع ہو چکی تھی اور مرزا صاحب پڑھ چکے تھے۔ چنانچہ اس کتاب کے بعض مضامین پر بحث ہوتی رہی۔ اس کے بعد سلطان سنجر سلجوقی کے متعلق مجھ سے چند سوالات کیے۔ صحیح جواب ملنے پر بہت خوش ہوئے اور حیدر آباد آنے کی دعوت دی اور فرمایا کا تیور پہنچ کر اپنا فوٹو بھیج دینا۔ میرے بعد منشی رحمت اللہ رعد سے مخاطب ہوئے اور فرمایا "جناب رعد! آپ تو میرے ہم مشرب ہیں۔" رعد نے معذرت کی کہ مسدس حالی کے بعد شاعری سے تائب ہو چکا ہوں تاہم دو تین غزلیں سنائیں جو قدیم رنگِ شاعری کا نمونہ تھیں۔ اس کے بعد موجودہ شاعری پر مناظرہ شروع ہوا۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد یہ بات طے ہوئی کہ اگرچہ ہماری شاعری عیوب سے خالی نہیں ہے لیکن اردو ادب کی ترقی کے لیے شاعری اور مشاعروں کا بقا ضروری ہے۔ البتہ اس امر کی ضرورت ہے کہ اردو

کانفرنس قائم کر کے اس میں یہ مسئلہ پیش کیا جائے اور جو عیوب ہیں ان کی اصلاح کی جائے۔

جب یہ دلچسپ بحث ختم ہو گئی تو میں نے دریافت کیا کہ مولوی سیّد احمد دہلوی نے تیس سال کی محنت میں فرہنگ آصفیہ (لغت اردو) لکھی ہے۔ تحقیقاتِ لغات اور محاورات اور زبان کی حیثیت سے اس کتاب کی نسبت جناب کی کیا رائے ہے۔ فرمایا سیّد احمد عرب سرائے کے باشندے تھے اور یہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔ مکرر سوال کرنا میں نے بھی ادب کے خلاف سمجھا اور اس جواب سے یہ نتیجہ نکالا کہ تحقیقاتِ لغات میں کوئی اعتراض نہیں البتہ فرہنگ کی زبان ٹکسال باہر ہے، کیونکہ عرب سرائے کی آبادی بیرونِ دلّی ہے۔

انگیٹھی سے فاصلے پر چاندی کی ایک تپائی پر ریشمی بستے میں ایک کتاب رکھی ہوئی تھی۔ منشی رحمت اللہ نے اجازت لے کر اسے کھولا، اندر سے طلائی کام کی ایک جلد نکلی۔ رعد نے خیال کیا کہ مصحف ہے، چاہتے تھے کہ آنکھوں سے لگائیں، اس پر مرزا صاحب کو ہنسی آگئی اور رعد بھی سمجھ گئے۔ سرورق کھولا تو "مہتابِ داغ" کا جلوہ نظر آیا۔

رعد نے جو اپنے تخلص کے اعتبار سے بلند آواز تھے، ایک غزل ("مہتاب داغ" سے) پڑھی، حاضرین بزم نے داد دی۔ لیکن جناب داغ کی موجودگی میں رعد کی یہ کڑک مجھے پسند نہ آئی۔ میں نے مرزا صاحب سے عرض کیا کہ مسافر نوازی کی تو یہ شان ہے کہ جناب خود ہی کچھ ارشاد فرمائیں۔ درخواست منظور ہوئی۔ رعد سے دیوان لے کر کئی غزلیں سنائیں۔ پڑھتے وقت یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا ایک بست سالہ نوجوان غزل پڑھ رہا ہے۔ آنکھیں پھڑکتی تھیں، ہاتھوں کو حرکت تھی۔ یہ محسوس ہو رہا تھا کہ متن کے ساتھ شارح تفسیر

کرتا جاتا ہے۔ بیس منٹ میں غزل خوانی ختم ہوئی۔ میری زبان سے برجستہ نکلا آج میں نے داغ نہیں ذوق علیہ الرحمۃ کی زبان سے غزلیں سنی ہیں۔ ذوق کا نام لیتے ہی آنکھوں میں آنسو آگئے اور چند منٹ تک خاموشی رہی۔ اس علمی مذاکرے کے بعد چائے کی کشتیاں آئیں جن میں زرد پیالیوں کے سوا کل سامان نقرئی تھا۔ بسکٹ، کیک، مٹھائیاں، پھل ہر قسم کے تھے۔ خود شریک نہیں ہوئے کیونکہ ناشتے کا وقت گزر چکا تھا۔ اس درمیان میں چند اصحاب دہلی کے ملاقات کے لیے آئے اور ہم لوگ رخصت ہوئے۔ مرزا صاحب نے مصافحے اور دعائے خیر کے بعد جانے کی اجازت دی۔ افسوس ہے کہ داغ سے یہی پہلی ملاقات تھی اور یہی آخری۔

یار سے چھیڑ چلی جائے۔۔۔

داغ شاید طبعاً عاشق مزاج تھے اور پھر جس ماحول میں انھوں نے آنکھ کھولی اور عنفوانِ شباب کا دور گزارا اس نے ان کے اس فطری میلان کو اور بھی تقویت دی۔ اس دور کے رؤسا اور امرا بہ یک وقت کئی کئی عورتوں سے جنسی تعلقات رکھنے کو نہ صرف یہ کہ معیوب نہیں سمجھتے تھے بلکہ اسے شانِ امارت کے اظہار کا ایک ذریعہ بھی خیال کرتے تھے۔ داغ نے اسی ماحول میں پرورش پائی تھی اور وہ اس ماحول کے اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکے۔ جب ان کے معاشی حالات زیادہ اچھے نہیں تھے تب بھی اپنی عشق پیشگی کے وہ اسیر رہے اور جب حالات بہت اچھے ہو گئے تو باوجود اس کے کہ وہ عمر کی آخری منزلوں میں تھے، وہ اور بھی کھل کھیلے اور بہ یک وقت دو دو تین تین طوائفوں سے ان کے مراسم رہے۔ یہ مراسم ظاہر ہے جنسی سے زیادہ جذباتی نوعیت کے رہے ہوں گے۔ اس عمر میں ان کی ذہنی کیفیت وہی رہی ہو گی جس کا اظہار غالب کے اس شعر میں ہوا ہے :

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

زندگی میں جانے کتنی طوائفوں سے داغ کے مراسم رہے ہوں گے لیکن ان کا کوئی دیرپا نقش داغ کے روز و شب پر نظر نہیں آتا۔ یہ دیرپا نقش صرف کلکتے کی منّی بائی حجاب

نے چھوڑا جسے وہ ہمیشہ اپنے دل میں بسائے رہے۔

حجاب کو داغ نے آخری بار ۳ جولائی ۱۸۸۲ء کو کلکتے میں الوداع کہا تھا۔ پھر وہ کچھ ایسے حالات سے دوچار رہے کہ حجاب سے ملاقات کی کوئی صورت نہیں نکال سکے۔ ۱۸۹۹ء میں انھوں نے نظام حیدر آباد کے ساتھ کلکتے کا سفر بھی کیا لیکن غالباً نظام کے معمولات کی پابندی کی وجہ سے انھیں حجاب سے ملاقات کی مہلت نہیں ملی۔ اس وقت تک کوئی حسّے صاحب حجاب کو پردہ نشیں بھی بنا چکے تھے۔ داغ کے اس سے مل نہ سکنے کی ایک وجہ یہ بھی رہی ہوگی۔

داغ کی حجاب سے ملاقات چاہے نہ ہو سکی ہو لیکن حجاب تک یہ خبریں ضرور پہنچی ہوں گی کہ داغ والیِ دکن کے ساتھ کلکتے آئے ہیں اور رئیسانہ ٹھاٹ باٹ کے ساتھ آئے ہیں۔ اس کے دل میں بھی پرانی یادوں نے انگڑائی لی ہوگی چنانچہ اس نے داغ کے ساتھ مراسلت کا رابطہ قائم کیا اور ان کے ایما پر حسّے صاحب سے طلاق لے کر داغ کے پاس حیدر آباد جانے کا فیصلہ کر لیا۔ دسمبر ۱۸۹۸ء میں داغ کی اہلیہ فاطمہ بیگم کا انتقال ہو گیا تھا، عجب نہیں کہ انھوں نے حجاب سے یہ وعدہ بھی کیا ہو کہ وہ اس سے نکاح کر لیں گے۔ اس خیال کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ دہلی دربار (جنوری ۱۹۰۳ء) سے داغ، جو نظام کی ہمراہی میں تھے، واپس ہوئے تو ان کے ورودِ حیدر آباد کے فوراً بعد کسی نے ان سے پوچھا کہ آخر اب آپ کیوں حجاب سے نکاح کرنا چاہتے ہیں، آپ کی بتیسی مصنوعی ہے، سر اور داڑھی کے بال خضاب سے رنگے جاتے ہیں؛ تو داغ نے کہا کہ مجھے اپنی کبر سنی کا احساس ہے لیکن میری مسہری آج بھی ایک نو عروس کی مسہری معلوم ہوتی ہے، رنگین جالی کے پردے ہیں، جن پر گوٹا لگا ہوا ہے اور انگوری بیل کی جھالر بھی لہرا رہی ہے۔ یہ سب روا ہے تو منی بائی حجاب میرے لیے کیوں ناجائز کر دی جائے۔ اس سے پہلے داغ نے اپنے بے تکلف دوستوں کی ایک محفل میں یہ سوال بھی اٹھایا تھا کہ کیا حسّے صاحب سے طلاق کے بعد حجاب کو عدت میں بیٹھنا ہوگا۔

داغ نے ۳ جولائی ۱۸۸۳ء کو حجاب کو کلکتے میں خدا حافظ کہا تھا۔ اٹھارہ انیس برس کے بعد انھوں نے ۱۸ یا ۱۹ جنوری ۱۹۰۳ء کو اسے حیدر آباد میں خوش

آمد ید کہا۔ انھوں نے حجاب کے قیام کے لیے ایک مکان کا انتظام کر دیا اور اس کی ماہانہ تنخواہ بھی مقرر کر دی جو سیّدہ جعفر کے بیان کے مطابق ابتدا میں ساٹھ روپے تھی پھر سو روپے کر دی گئی (داغ دہلوی، حیات اور کارنامے، دہلی اردو اکادمی، ص ۵۶)۔
حجاب کا ہاتھ کھلا ہوا تھا۔ یہ رقم اس کی ضرورتوں کی کفالت کے لیے ناکافی تھی، وہ مزید رقم کا مطالبہ کرتی ہو گی۔ داغ نے اپنے ایک عزیز شاگرد میر حسن علی خاں کو ایک بار لکھا تھا: "حجاب کی ضرورتیں پوری نہیں ہوتیں، آئے دن سرگراں رہتی ہے۔"
(خطوطِ داغ، مرتبہ رفیق مارہروی)

حجاب حیدر آباد پہنچی تو اس پر مذہب کا رنگ چڑھ چکا تھا اور وہ صوم و صلوٰۃ کی پابند تھی۔ رمضان کے علاوہ بھی روزے رکھنے لگی تھی اور اوراد و وظائف سے بھی شغف پیدا ہو گیا تھا۔ میر یٰسین علی خاں نے، جنھوں نے اس وقت حجاب کو دیکھا تھا، اس کا حلیہ یوں بیان کیا ہے: "کوئی ۴۰۔۴۵ کا سن ہو گا۔ رنگ صاف، آنکھیں بڑی بڑی، ناک اونچی، بالوں پر خضاب چڑھا ہوا، پتلے پتلے لب، میانہ قد، اونچی پیشانی، مانگ پھٹی پھٹی سی، تنگ اطلس کا پاجامہ، مغزی ٹکا ہوا لانبا کرتا اور اس پر سفید اوڑھنی، پاؤں میں دہلی کی جوتی اور دونوں ہاتھوں کی پتلی پتلی انگلیوں میں انگوٹھیاں"

(نگار، جنوری ۱۹۵۳ء)

حجاب یہی توقع لے کر آئی تھی کہ داغ اس سے نکاح کریں گے۔ اس نے آنے سے پہلے ہی داغ کو لکھ دیا تھا کہ "جب تک نکاح نہیں کر لوں گی، تمھارے سامنے نہیں آؤں گی۔ میں نے یہ تمام جھگڑا اس لیے نہیں کیا کہ شرعی باتوں کی خلاف ورزی کروں۔ تم اس بھروسے میں نہ رہنا کہ میں تمھارے سامنے آؤں۔"

داغ کے روزنامچہ نگار کا بیان ہے "ایک طوائف کی ایسی دنیا بدلی ہے کہ کوئی وقت وظیفے سے خالی نہیں ہے...... مرزا صاحب فرما رہے تھے کہ دو چار برس میں ولیہ ہو جائیں گی" (۲۲ جنوری ۱۹۰۳ء)

لیکن داغ حجاب کو اس رنگ میں دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ انھوں نے جانماز اور تسبیح بھجوانے کا حجاب کا مطالبہ پورا کرتے ہوئے یہ بھی کہلا بھیجا کہ "جب تک

تمھارے اوراد و وظائف نہیں چھوٹیں گے، اس وقت تک تم انسان نہیں بن سکتیں اور جب تک انسان نہ بن سکو، اس وقت تک میرے کام کی نہیں ہو سکتیں۔"

جیسا کہ اوپر بیان ہوا، داغ حجاب کو سو روپے ماہوار دینے لگے تھے مگر وہ اس رقم کو اپنی کفالت کے لیے ناکافی خیال کرتی تھی اور اس نے اِدھر اُدھر سے قرض لینا شروع کر دیا جس کی ادائگی بالآخر داغ ہی کو کرنی پڑتی۔ پھر حجاب نے کلکتے سے اپنے متوسلین کو بھی بلا لیا اور اس کے نتیجے میں روزمرہ کے اخراجات اور بڑھ گئے۔ داغ حجاب کی خاطر یہ اضافی اخراجات بھی شاید جھیل لیتے لیکن حجاب ان کے معمولات میں بھی دخیل ہونے لگی۔ داغ کا مشہور شعر ہے :

تو جو ہر جائی ہے، اپنا بھی یہی طور سہی
تو نہیں اور سہی، اور نہیں اور سہی

حجاب نے سوچا ہوگا کہ اب اِدھر اُدھر کے سارے رشتے توڑ کر وہ داغ کے پاس چلی آئی ہے تو انھیں بھی "تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی" کا رویّہ ترک کر دینا چاہیے۔ ادھر داغ کا طرزِ عمل یہ تھا کہ انھی دنوں جب حجاب کی حیدر آباد میں آمد آمد تھی اور وہ اسے ایسے عاشقانہ خطوط لکھ رہے تھے :

"دشمنِ جانی، سلامِ شوق۔ عین انتظار میں تمھارا محبت نامہ دستیاب ہوا۔ کئی بار پڑھا اور آنکھوں سے لگایا، چوما اور چھاتی پر دھرا۔ تم لکھتی ہو مجھے بھول جاؤ اور اگر نہ بھولو تو بدل جاؤ۔ یہ کر لو گے جبھی تمھارے پاس آؤں گی۔ خوب، تم کو میں بھول جاؤں :

تو بھولنے کی چیز نہیں خوب یاد رکھ
نادان! کس طرح تجھے دل سے بھلائیں ہم

اچھا تم یہاں آ جاؤ، پھر ہم ایک دوسرے کو بھولنے کی کوشش کریں گے۔"

کہ ان کے شاگردِ رشید نوح ناروی حیدر آباد آئے اور انھوں نے استاد کی خدمت میں الٰہ آباد کی ایک طوائف بنی جان کی تصویر سوغات میں پیش کی۔ داغ تصویر دیکھ کر ہی بنی جان پر لٹو ہو گئے اور انھوں نے اسے لکھا : "کیوں جی! تم سے کیونکر ملیں، تم کو

کیونکر دیکھیں، کیونکر سنیں اور نہ دیکھیں تو کیونکر جئیں"

(انشائے داغ، ص٦٦۔ خط پر ١٥ دسمبر ١٩٠١ء کی تاریخ درج ہے)

خط میں "کیونکر سنیں" کے لفظ توجہ طلب ہیں۔ داغ کو گانا سننے کا بہت شوق تھا۔ حجاب کے حیدر آباد آجانے کے بعد بھی انھوں نے اختر جان نامی ایک مغنّیہ کو ملازم رکھا ہوا تھا جس سے کبھی کبھار داغ گانا سنا کرتے تھے۔ حجاب نے اس کی برطرفی کا بھی مطالبہ کیا اور عدت پوری ہوتے ہی نکاح کی بھی خواستگار ہوئی۔ داغ نے خود بھی یہی ڈھنڈورا پیٹا تھا کہ وہ حجاب سے نکاح کرنا چاہتے ہیں مگر اب سچ مچ یہ مرحلہ آیا تو وہ گھبرا گئے۔ ایک دن انھوں نے اپنے احباب سے کہا "کچھ سنا؟ نکاح کا تقاضا ہو رہا ہے۔ بڈھے ہو گئے، منہ میں دانت نہیں، پیٹ میں آنت نہیں، نکاح کا ماحصل اور جزوِ اعظم دونوں کے پاس ندارد۔"

حجاب نے کچھ دن انتظار کیا کہ داغ اس کی راہ پر آجائیں، اُدھر داغ نے بھی نباہنے کی اپنی سی کوشش کی مگر دونوں ہی ناکام رہے۔ داغ سے مایوس ہو کر حجاب اگست ١٩٠٤ء میں کلکتے واپس چلی گئی ــــ تمکین کاظمی "معاشقہ حجاب و داغ" میں لکھتے ہیں:

> "یہ صرف وضع داری اور دل لگی تھی۔ اس جذبہ تفریح کو محبت سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ دونوں طرف ایک ہی جذبہ کار فرما تھا۔ داغ اپنی دولت و ثروت اور عزت و امارت کا نقش حجاب کے دل پر بٹھانا چاہتے تھے اور حجاب کی نظر داغ کی دولت پر تھی" (ص٦١)

یہ خیال کسی حد تک درست ہو سکتا ہے۔ داغ کے ایک مقطعے سے حجاب کے رویّے کی نشاندہی ہوتی ہے:

داغ سے کہتے ہیں سب دے دو مجھے
جو ملا ہے تم کو آصف جاہ سے

لیکن کم از کم داغ کے دل میں حجاب کے لیے نرم گوشہ ضرور تھا۔ حجاب کے کلکتے چلے جانے کے بعد داغ زیادہ زندہ نہیں رہے لیکن جب تک رہے، اسے ماہانہ کچھ بھجواتے رہے۔

○

حجاب اگست ۱۹۰۴ء میں داغ سے خفا ہو کر کلکتے واپس چلی گئی تھی۔ اس کے جانے کے لگ بھگ سات مہینے بعد ۱۶ فروری ۱۹۰۵ء کو داغ نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ "دبدبۂ آصفی" (شمارہ ۹، جلد ۸، صفحہ ۲۹، ۶ ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ) میں داغ کے مرض الموت کی تفصیل شائع ہوئی تھی جس کے مطابق وہ آٹھ دن تک بسترِ علالت پر زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہے۔ بائیں طرف فالج کے حملے کی وجہ سے جسم کا ایک حصہ بیکار ہو گیا تھا۔ نوراللہ محمد نوری نے عبدالمجید آزاد کے حوالے سے لکھا ہے کہ زندگی کے آخری دنوں میں داغ کو زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ انھوں نے آزاد سے کہا تھا "اب مجھے عطر کی بو محسوس نہیں ہوتی، گانا سنوں تو وحشت ہونے لگتی ہے، غزل کہنے اور سننے سے طبیعت دور بھاگتی ہے...... یہ سب اس بات کا ثبوت ہے کہ میری زندگی کے دن ختم ہو چکے ہیں :

ہوش و حواس، تاب و تواں، داغ جا چکے
اب ہم بھی جانے والے ہیں، سامان تو گیا

(داغ دہلوی، ص ۲۴)

آصف سادس نے اپنے استاد کی رحلت کی خبر سن کر تجہیز و تکفین کے لیے خزانۂ شاہی سے تین ہزار روپے بھجوائے۔ داغ کی نمازِ جنازہ عیدالضحیٰ کی صبح مکہ مسجد میں ادا کی گئی اور درگاہِ یوسفین میں وہ اپنی رفیقۂ حیات کے پہلو میں مدفون ہوئے۔ وہیں ان کے ہمعصر امیر مینائی بھی آسودۂ خاک ہیں۔

مرزا غالب سے راہ ورسم

جیسا کہ گزشتہ صفحات میں ذکر آچکا ہے، داغ کے والد نواب شمس الدین احمد خاں، والیِ فیروز پور جھرکہ، نواب احمد بخش خاں کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ انھی احمد بخش کے چھوٹے بھائی نواب الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی امراؤ بیگم سے جو رشتے میں داغ کی پھوپھی تھیں، غالب کی شادی ہوئی، اس طرح غالب داغ کے پھوپھا ہوئے۔ ان کے درمیان قدرے دور کا سہی، ایک رشتہ اور بھی تھا : غالب کے چچا مرزا نصر اللہ بیگ خاں کی شادی احمد بخش خاں کی بہن سے ہوئی تھی جو شمس الدین احمد خاں کی پھوپھی اور داغ کی دادی ہوئیں۔

لیکن ان قربتوں میں شروع ہی سے کچھ تلخیاں راہ پا گئی تھیں۔ غالب کے چچا نصر اللہ بیگ خاں کی وفات کے بعد برطانوی حکومت نے ان کی جاگیر اپنے قبضے میں لے لی اور ان کے ورثا کے لیے دس ہزار روپے سالانہ پنشن مقرر کر دی۔ اس پنشن کی ادائگی کا ذمہ دار احمد بخش خاں کو بنایا گیا۔ نواب احمد بخش خاں نے پنشن کے مستحقین میں خواجہ حاجی نام کے ایک شخص کو بھی شامل کر لیا، جس کا بقول غالب ان کے خاندان سے کوئی رشتہ نہیں تھا۔ احمد بخش خاں کی زندگی میں بھی غالب کو پنشن کی یہ تقسیم اکھرتی تھی، لیکن کچھ تو ان کے لحاظ میں اور کچھ اس وجہ سے کہ احمد بخش خاں وقتاً فوقتاً ان کے اور ان کے چھوٹے بھائی میرزا یوسف کے ساتھ کچھ نہ کچھ سلوک کرتے

رہتے تھے، وہ خاموش رہے۔ احمد بخش خاں کے بعد جب پنشن کی ادائگی شمس الدین احمد خاں کے ہاتھ میں آئی تو ان کا سلوک غالب اور ان کے لواحقین کے ساتھ نہ صرف غیر ہمدردانہ بلکہ مخاصمانہ ہو تا گیا۔ شمس الدین احمد خاں اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں کو بھی لوہارو کی جاگیر دینے کو تیار نہیں تھے جو خود احمد بخش خاں ان کے نام کر گئے تھے۔ اس نزاع میں ولیم فریزر نے امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں کی مدد کی۔ اس نے معاملہ کلکتے بھیج دیا جہاں سے فیصلہ ہوا کہ لوہارو پر شمس الدین احمد خاں کا نہیں، دونوں چھوٹے بھائیوں کا حق ہے۔ اس فیصلے کے بعد شمس الدین احمد خاں کے ایک معتمد اور ان کے داروغہ شکار کریم خاں نے ولیم فریزر کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ بعد میں شمس الدین احمد خاں بھی اس قتل میں ملوث قرار دیے گئے اور انھیں پھانسی کی سزا ہوئی۔

ولیم فریزر غالب کے محسنوں میں تھا اور امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں سے بھی غالب انسیت رکھتے تھے۔ اپنے ساتھ ہونے والی اس ناانصافی کے علاوہ جس کے اصل ذمہ دار احمد بخش خاں تھے لیکن جس کے لیے غالب اب شمس الدین احمد خاں کو ذمہ دار ٹھہرانے لگے تھے، امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں کی حق تلفی کی کوشش اور ولیم فریزر کے قتل نے غالب کو شمس الدین احمد خاں کا اور بھی مخالف بنادیا اور کہا جاتا ہے کہ ولیم فریزر کے قتل کے معاملے میں جن لوگوں نے شمس الدین احمد خاں کے خلاف حکومت سے مخبری کی تھی، ان میں شمس الدین احمد خاں کے چچازاد بھائی فتح اللہ خاں اور مرزا غالب شامل تھے۔ خود غالب بھی اسے قبول کرتے ہیں۔ تاسخ کے نام اپنے ایک خط میں انھوں نے لکھا ہے :

> "جب یہ واقعہ ہوا تو مجسٹریٹ بہادر نے اس معاملے کی تحقیق اور عقدہ کشائی کے لیے مجھے اپنے ساتھ ملالیا۔ یہاں تک کہ والیِ فیروز پور مجرم قرار پائے اور سرکار کے حکم سے اپنے کچھ خاص لوگوں کے ساتھ گرفتار کر لیے گئے اور ان کی جاگیر پر سرکار نے اپنے آدمی بھیج دیے۔ چونکہ میرے اور والیِ فیروز پور کے تعلقات کشیدہ تھے اور

شہر کے لوگ اس حقیقت سے واقف تھے، اس لیے سب میرے خلاف ہو گئے۔ان کافر نعمت اور محسن کش (شمس الدین احمد خاں) کی گرفتاری کو میری مخبری کا نتیجہ سمجھا گیا۔یعنی دہلی کے عوام وخواص کا خیال ہے کہ شمس الدین خاں بے گناہ تھے۔ فتح اللہ خاں اور اسداللہ خاں نے جھوٹ سچ بول کر حکام کو بہکادیا اور انھیں مصیبت میں گرفتار کرادیا۔

......دہلی کے یاوہ گو مجھے ہر وقت برا بھلا کہتے رہتے ہیں۔شروع میں تو مجھے صرف ولیم فریزر بہادر کی موت کا غم تھا اب شہر کے لوگوں نے مجھے تنگ اور عاجز کرر کھا ہے"

(پنج آہنگ، ۱۸۵۳ء، ص ۲۴۷)

داغ بھی غالب کی اس کارگزاری سے بے خبر نہیں تھے۔، رفیق مارہروی نے "بزم داغ" میں ان کا ایک بیان نقل کیا ہے جس میں وہ کہتے ہیں :

"مرزا غالب کے دادا مرزا قوقان بیگ جو سمرقند سے آئے تھے، مرہٹوں کے ہمنوا ہوئے اور ان کو بلند شہر کے ضلع میں پہاسو کا تعلقہ مل گیا۔انھی قوقان بیگ کے ایک لڑکے عبداللہ بیگ خاں تھے جن سے غالب پیدا ہوئے۔ جب انگریز دہلی پر قابض ہوئے تو مرزا غالب کے بزرگ برطانوی حکومت کے خیر خواہ رہے، جس کے صلے میں ان کو سونسا اور سونک مل گئے جو ایک مدت تک مرزا کے خاندان میں رہے۔ بعد میں انگریزوں نے اپنی حکومت میں شامل کر لیے اور مرزا کے خاندان کے لیے دس ہزار روپے سالانہ مقرر کر دیے گئے۔ چونکہ مرزا غالب کے چچا کی شادی نواب احمد بخش خاں والیِ فیروزپور جھرکہ کی بہن سے ہوئی تھی لہذا یہ پنشن بھی اسی ریاست کے ذمے کر دی گئی جو کچھ عرصے پوری ادا ہوئی۔اس کے بعد اس میں سے بقدر نصف تخفیف ہو کر ایک دوسرے شخص کے لیے مخصوص ہو گئی۔ یہ

چیز مرزا غالب وغیرہ کو ناگوار گزری اور مرزا غالب نے فریزر کے
بل بوتے پر مقدمہ لڑا۔ احمد بخش خاں اپنی ریاست بیٹوں کو دے کر
خانہ نشیں ہو چکے تھے اور ان کے ورثا میں سخت اختلاف تھا اور چونکہ
نواب شمس الدین احمد خاں ریاست کے سربراہ تھے، لہٰذا مرزا غالب کا
مقدمہ انھی کے خلاف دائر ہوا۔ مگر بوجوہ چند در چند وہ مقدمہ خارج
ہو گیا اور اس طرح مرزا غالب کو نواب شمس الدین احمد خاں سے
پوری پوری مخالفت ہو گئی۔ کہا جاتا ہے کہ فریزر کے قتل کے سلسلے
میں انگریزوں سے جو چغل خوریاں کی گئیں، ان میں مرزا غالب کا
بھی حصہ تھا۔" (ص ۲۱۷)

یہ بات غور طلب ہے کہ اس تکلیف دہ سچائی سے آگاہی کے باوجود غالب کے تئیں کوئی جذبہ عناد داغ کے دل میں پیدا نہ ہوا۔ اسی بیان میں جو "بزم داغ" کے حوالے سے اوپر نقل ہوا، داغ کہتے ہیں :

"بہر حال کچھ بھی ہو، میں نے مرزا غالب کی شاعرانہ اہلیت اور تبحر
کے پیش نظر ان کی عزت کی اور انھوں نے میرا خیال کیا۔"
(ص ۲۱۸)

تمکین کاظمی لکھتے ہیں :

"مرزا غالب رشتے میں داغ کے پھوپھا تھے مگر (ان کے والد) شمس
الدین احمد خاں کے دشمن تھے چنانچہ مخبری کر کے شمس الدین احمد
خاں کو پھانسی کے تختے پر پہنچانے والے غالب ہی تھے۔ مگر داغ نے
ان سے مراسم پیدا کر لیے تھے اور ان کے پاس آمد و رفت رکھی تھی۔
چنانچہ جب ذوق کا انتقال ہو گیا تو داغ نے زیادہ وقت غالب کے پاس
گزارنا شروع کیا۔ غالب داغ سے شطرنج کھیلتے، اپنی طرح کی ہوئی
زمینوں پر غزلیں کہلواتے اور سن کر خوش ہوتے تھے۔"

(نواب مرزا خاں داغ، لاہور، ۱۹۶۰ء، ص ۳۸)

شطرنج اور شاعری کے علاوہ داغ اور غالب کے کچھ اور بھی مشترک شوق تھے۔ مثلاً آم کے دونوں رسیا تھے۔ آموں کی صفت میں غالب نے جو مثنوی لکھی ہے، اس سے سب واقف ہیں :

بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے
خامہ، نخلِ رطب فشاں ہو جائے

مذکورہ کتاب کے ص ۲۴۹ پر تمکین کاظمی لکھتے ہیں کہ ۱۸۹۳ء میں جب حیدر آباد میں آم کی فصل کم ہوئی تو داغ نے حسنِ طلب میں دو رباعیاں کہہ کر والیِ دکن کے حضور میں گزرانیں۔ والیِ دکن نے داغ کو آموں سے سر فراز کیا۔ شکریے میں داغ نے ۲۳ شعر کا قطعہ کہہ کر پیش کیا۔ آموں کی توصیف میں چند شعر یہ ہیں :

کشتیوں میں آم جو ہیں رنگ رنگ
داغ کا گھر آج ہے رشکِ چمن
سُرخ میں ہے لالہ رخوں کی بہار
سبز میں ہے سبزہ خطوں کی پھبن
زرد میں ہے رنگِ گُلِ زعفراں
کیسری پوشوں کی ہے اک انجمن
آم کے منہ پر ہے سیاہی، کہ ہے
مردمکِ چشمِ بتِ سحر فن

سونگھ کے ہو جائے معطر دماغ
منہ پہ مگر ان کے ہے مشکِ ختن
رنگ ہے وہ شوخ کہ جیسے پری
اور وہ خوشبو کہ معطّر دہن

گر کبھی ان آموں کا رس چوس لیں
ہونٹ ہی چاٹا کریں شیریں دہن
انبۂ شیریں جو اسے ہو نصیب
نام بھی شیریں کا نہ لے کوہکن

داغ، غالب کی شاعرانہ عظمت کے دل سے قائل تھے۔ دلّی کی بربادی کا جو نوحہ انھوں نے لکھا ہے، اس کے مقطع میں کہتے ہیں :

تیرؔ و غالبؔ و آزردہ سے پھر لوگ کہاں
داغؔ اب یہ ہیں غنیمت ہمہ دانِ دہلی

غالب نے بھی کئی موقعوں پر داغ کی شاعرانہ صلاحیتوں کو سراہا ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی نے "یادگارِ غالب" میں لکھا ہے :

"ایک صحبت میں غالب نواب مرزا خاں داغ کے اس شعر کو بار بار پڑھتے تھے اور اس پر وجد کرتے تھے :

رخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

(یادگارِ غالب، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۱۹۹۶ء، ص ۸۳)

داغ کے شاگرد مولانا احسن مارہروی "آئینۂ داغ" میں لکھتے ہیں :

"حضرتِ غالب جیسے اکھل کھرے مزاج کے آدمی کو کون نہیں جانتا...... سنا گیا ہے کہ منجملہ اور اشعار کے حضرت استاذی کے یہ چار شعر بھی اکثر پڑھا کرتے تھے۔ وہ اشعار یہ ہیں :

رخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

تیرے جلوے کا تو کیا کہنا مگر
دیکھنے والے کو دیکھا چاہیے

افتادگی پہ بھی نہ گئی اس کی جستجو
گویا زمیں پہ سایۂ مرغِ پریدہ ہوں

کیا کیا فریب دل کو دیے اضطراب میں
ان کی طرف سے آپ لکھے خط جواب میں"

(ص ۱۵۲)

رفیق مارہروی نے اپنی کتاب "بزم داغ" (لکھنؤ، ۱۹۵۶ء، ص ص ۴۰۔۳۸)
میں داغ کا ایک بیان ان لفظوں میں دہرایا ہے :

"آج مرزا صاحب نے برسر تذکرہ فرمایا کہ میں نے مرزا غالب کی
مشہور غزل :

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

پر غزل کہہ کر جب انھیں سنائی تو بڑی تعریف کی۔ بعض بعض اشعار
پر تو مجھے گلے سے لگالیا۔ میں نے اپنی غزل کا جب یہ شعر پڑھا :

دلبروں پر طبیعت آتی ہے
اس طرح، اس قدر نہیں آتی

تو یہ شعر غالب نے کئی دفعہ پڑھوایا اور بے حد پسند کیا۔ اس کے بعد
جب میں اس شعر پر پہنچا :

دل کے لینے کی گھات ہے کچھ اور
یہ تجھے مفت بر نہیں آتی

تو غالب بے چین ہو گئے۔ زانو پر ہاتھ مار کر بولے۔ خدا نظر بد سے بچائے، صاحب زادے تم نے تو کمال کر دیا۔ میری غزل کے اس شعر پر:

حال معلوم ہے قیامت کا
بات کہنے میں پر نہیں آتی

مرزا غالب کھڑے ہو گئے، مجھے سینے سے لگالیا۔ دیر تک کھڑے کھڑے جھومتے رہے اور میرے شعر کو دہراتے رہے۔ مرزا صاحب نے فرمایا کہ میں ہر دوسرے تیسرے روز حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ مختلف باتیں ہوا کرتی تھیں۔ شطرنج بھی ہوتی تھی۔ جب میں ہار جاتا تھا تو مرزا صاحب فرماتے کہ اس جرمانے میں اپنی غزل سناؤ۔ ایک دفعہ میں شطرنج کی بازی ہارا۔ حسبِ معمول مرزا صاحب بولے کہ غزل سناؤ۔ میں غزل پڑھنا ہی چاہتا تھا کہ فرمایا کہ میری کہی ہوئی زمین "ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے" میں جو غزل تم نے کہی ہے وہ سناؤ۔ میں نے تعمیل حکم کی۔ میرے اس شعر پر :

اے فلک سامانِ محشر ہی سہی
اپنی آنکھوں کو تماشا چاہیے

مرزا بولے، میرے خیال کی کتنی پیاری ترجمانی کی ہے اور پھر اپنا شعر پڑھا :

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی، نغمۂ شادی نہ سہی

اس کے بعد میں نے اپنا دوسرا شعر پڑھا :

گو تری نظروں سے کل گر ہی پڑیں
آج تو کوئی ٹھکانہ چاہیے

میرے اس شعر پر غالب تڑپ گئے۔ بولے ٹھہر، زمین پر ہاتھ ٹیک کر! مجھے، میرے گرد چار پانچ بار گھومے۔ گھومنے کی حالت میں نہایت

دردناک آواز میں میر ایہ شعر پڑھتے جاتے تھے۔"

ممکن ہے اس بیان میں کچھ مبالغہ راہ پا گیا ہو کیونکہ خود داغ کے ایک دوسرے بیان کے مطابق غالب داد دینے میں اتنے فراخ دل نہیں تھے۔اسی کتاب میں آگے چل کر رفیق مارہروی لکھتے ہیں :

"ایک محفل میں کئی شاعر موجود تھے۔ موضوعِ بحث ذوق، مومن اور غالب وغیرہ اساتذہ تھے۔ کوئی غالب کو سراہ رہا تھا تو کوئی مومن کو، کوئی ذوق کے گن گا رہا تھا تو کوئی کسی دوسرے قدیم شاعر کے لیے خوش خیال تھا...... جب ہر شخص رائے زنی کر چکا اور بحث کسی نتیجے پر نہ پہنچی تو لوگ مرزا صاحب (داغ) کی طرف متوجہ ہوئے۔ مرزا صاحب نے فرمایا کہ مومن شاعر تو باکمال تھے لیکن ان میں رعونت بہت تھی، وہ کسی کا شعر پسند ہی نہیں کرتے تھے۔ رہے استاد ذوق وہ پون منصف تھے۔ مرزا غالب میں رواداری تھی لیکن وہ بھی آدھے منصف تھے اور بقدرِ ضرورت داد دیتے تھے۔"

(ص ص ۴۷۔۴۶)

اس میں دو رائیں نہیں کہ اگر ایک طرف داغ غالب کی استادی کے معترف تھے تو دوسری طرف غالب بھی ان کے رنگِ سخن کو پسند کرتے تھے۔ "آئینۂ داغ" میں نثار علی شہرت رقمطراز ہیں :

"ایک روز میں غالب کی خدمت میں حاضر ہوا...... میں نے ادب کے ساتھ گزارش کی کہ داغ کی اردو کیسی ہے؟ فرمانے لگے کہ ایسی عمدہ کہ کیا کسی کی ہوگی۔ ذوق نے اردو کو اپنی گود میں پالا تھا، داغ اس کو نہ صرف پال رہا ہے بلکہ تعلیم دے رہا ہے......" (ص ۳۴)

غالب دربارِ رامپور کے پرانے نمک خوار تھے، جب داغ اس دربار سے متوسل ہوئے تو وہ ان سے بھی اپنی پیغام رسانی کا کام لینے لگے۔ ذیل کے چند خطوط سے اس کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ خطوط "مکاتیب غالب" (مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی،

رامپور، ۱۹۳۷ء) میں شامل ہیں :

"نواب مرزا نے دہلی آکر پہلے نوید بزم آرائی سنائی۔ چاہتا تھا کہ اس کی تہنیت لکھوں۔ کل اس نے (داغ نے) ازروئے خطِ آمدۂ رامپور، حضرت جناب عالیہ (یوسف علی خاں کی والدہ فتح النسا بیگم) کے انتقال کی خبر سنائی۔" (خط بنام یوسف علی خاں ناظم، ص ۱۷)

۱۴ اگست ۱۸۶۵ء کے ایک خط میں غالب نواب کلب علی خاں کی عیادت ان الفاظ میں کرتے ہیں :

"حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت، سلامت
بعد تسلیم معروض ہے، کل برخوردار نواب مرزا خاں داغ کی تحریر سے معلوم ہوا کہ حضرت کا مزاجِ اقدس ناساز ہو گیا تھا، اب خدا کے فضل و کرم سے افاقت ہے۔ نواب مرزا نے مجھ پر ستم کیا کہ پہلے سے یہ حال نہ رقم کیا، جو دعا جب کرتا، اب بھی وردِ روز و شب ہے۔ مگر یہ خیال کہ حضور کو یہ خیال گزرے گا کہ غالب رسمِ عیادت بجانہ لایا، سخت جگر سوز ہے۔ اب اس خط کے جواب میں نویدِ عافیت کا امیدوار اور یہ سوچ کر کہ آج کے آٹھویں دن جواب آئے گا، بے قرار ہوں۔" (ص ۵۷)

۲۹ مارچ ۱۸۶۶ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں :

"اپنا حال اس سے زیادہ کیا لکھوں کہ آگے ناتواں تھا اور اب نیم جاں ہوں۔ برخوردار نواب مرزا خاں (داغ) اپنے مشاہدے کے مطابق جو میری حقیقت عرض کرے، وہ مسموع و مقبول ہو۔" (ص ۶۹)

غالب ہمیشہ ضرورت مند رہتے تھے اور اپنے ممدوحین سے اپنی ضرورت مندی کا ذکر کرتے رہتے تھے۔ دربار رامپور سے انھیں ماہانہ وظیفہ ملتا تھا، مگر وہ اس پر اکتفا کرنے کو تیار نہ تھے اور انھیں عنایاتِ مزید کی طلب رہتی تھی۔ نواب کلب علی خاں کے نام ۶ اکتوبر ۱۸۶۶ء کے خط کا ایک جملہ یہ ہے "آپ کو میری حالت داغ

نے بتادی ہوگی" جواب میں غالباً نواب صاحب نے لکھا کہ داغ نے اس سلسلے میں ان سے کوئی بات نہیں کی۔ اس پر افسوس کرتے ہوئے غالب نواب صاحب کو لکھتے ہیں :

"افسوس کہ برخوردار نواب مرزا خان نے میرا حال سامعۂ اقدس پر عرض نہ کیا۔ حضور ملک و مال جس کو جس قدر چاہیں، عطا کر سکتے ہیں۔ میں آپ سے صرف راحت مانگتا ہوں اور راحت منحصر اس پر ہے کہ قرضِ باقی ماندہ ادا ہو جائے اور آئندہ قرض لینے کی حاجت نہ پڑے۔" ص ۸۱)

۱۴ اگست ۱۸٦۷ء کے ایک خط کا اقتباس، جس سے پتا چلتا ہے کہ داغ نے انھیں خط لکھ کر یہ مژدہ سنایا تھا کہ نواب صاحب نے ان کی معروضات قبول کر لی ہیں :

"تین التماسیں پیش ہوئی تھیں (اس سے پہلے کے کچھ خطوط کی روشنی میں ڈاکٹر خلیق انجم کے مطابق وہ تین التماسیں غالباً یہ تھیں : پہلی یہ کہ غالب کا قرض چکا دیا جائے، دوسری یہ کہ غالب کے متبنّٰی حسین علی خاں کی شادی کے لیے ڈھائی ہزار روپے دیے جائیں اور تیسری یہ کہ حسین علی خاں کا کچھ وظیفہ مقرر کر دیا جائے)، سو اب پہلے برخوردار نواب مرزا خاں کی تحریر سے اور پھر جناب مظفر حسین خاں بہادر کے خط سے ان خواہشوں کے منظور و مقبول ہونے کی نوید پائی۔" (۱۰۷)

لیکن یہ لفظی نوید عملی شکل اختیار نہیں کر سکی، اس کا علم ایک اور خط سے ہوتا ہے :

"حال میرا تباہ ہوتے ہوتے اب یہ نوبت پہنچی کہ اب کی تنخواہ میں سے ۵۴ روپے بچے۔ ٦۴ روپے کا چٹھا ماہوار کا سولہ ماہی کا دینا۔ مجملاً آٹھ سو روپے ہوں تو میری آبرو بچتی ہے۔ ناچار حسین علی خاں کی شادی اور اس کے نام کی تنخواہ سے قطع نظر کی۔ اب میں اس باب

میں عرض کروں، کیا مجال، کبھی نہ کہوں گا۔ آٹھ سو روپے مجھ کو اور دیجیے۔ شادی کیسی؟ میری آبرو بچ جائے تو غنیمت ہے۔ برخوردار نواب مرزا خاں کے خط میں یہ حال مفصل لکھا ہے، وہ عرض کرے گا۔"

ایک اور خط میں بھی داغ کا حوالہ ہے :

"حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت، سلامت
بعد تسلیم معروض ہے۔ بہت دن ہوئے کہ برخوردار نواب مرزا خاں نے مجھ کو مبارکباد لکھی تھی کہ حضور نے تیرے قرض کے ادا کرنے کی نوید دی ہے اور مقدارِ قرض پوچھی ہے۔ سو میں نے ان کو لکھ بھیجا تھا کہ آٹھ سو روپے میں میرا قرض تمام ہو جائے گا۔ اس تحریر سے یاد دہی منظور ہے، زیادہ حدِ ادب" (ص ۱۰۸)

مرزا غالب کے ان خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ داغ کے قیام رامپور کے زمانے میں انھیں خط بھی لکھتے رہے ہیں، وہ خط کیا ہوئے، وثوق کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے، قیاساً کہا جا سکتا ہے کہ ضائع ہو گئے ورنہ کسی کے ہاتھ تو لگتے۔

مرزا غالب کی زندگی میں ان کے قرض کی ادائگی کی یہ خواہش پوری نہیں ہوئی لیکن ان کے انتقال کے بعد اس مد میں نواب صاحب نے ان کی بیوہ کو چھ سو روپے بھجوائے۔ اس میں داغ کی سعی و سفارش کو بھی دخل تھا۔ تفصیل مالک رام کی زبانی سنیے:

"مرزا غالب کی وفات کے بعد امراؤ بیگم (غالب کی بیوہ) پر گویا غم و الم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا...... انھوں نے یکم اگست ۱۸۶۹ء کو نواب خلد آشیاں (کلب علی خاں) کی خدمت میں لکھا کہ آٹھ سو روپے میرزا مرحوم کا قرض باقی ہے، اس کی ادائگی کے لیے مدد فرمائی جائے۔ جب ایک ماہ تک اس درخواست پر کوئی حکم صادر نہ ہوا تو انھوں نے ۲ ستمبر ۱۸۶۹ء کو دوبارہ لکھا۔ اس پر ۹ ستمبر کو نواب میرزا خاں داغ کو تحقیق کر کے رپورٹ کرنے کا حکم ہوا۔ آخر کار نواب خلد آشیاں نے ۳۰ اکتوبر ۱۸۶۹ء

کو حکم دیا کہ امراؤ بیگم کو چھ سو روپے کی ہنڈی بھیج دی جائے۔"

(ذکرِ غالب، پانچواں ایڈیشن؛ ص ۱۴۱)

جیسا کہ تمکین کاظمی نے لکھا ہے اور جس کا حوالہ اوپر آیا، ذوق کے انتقال کے بعد دو ڈھائی سال تک داغ غالب کے بہت قریب رہے۔ ان کا خیال یہ بھی ہے کہ "اگر داغ کو ابتداءً ذوق کا تلمذ اور اس کے بعد غالب کی ہم نشینی نصیب نہ ہوتی تو وہ داغ نہ بن سکتے تھے" (مرزا خاں داغ، ص ۴۰) کالی داس گپتا رضا نے اپنے مجموعۂ مضامین میں جو "جہاں استاد داغ دہلوی" کے نام سے رسالہ "اسباق" پونہ کی خصوصی اشاعت کی صورت میں ۱۹۹۷ء میں شائع ہوا تھا، تمکین کاظمی کے اس خیال کی تائید کرتے ہوئے داغ کے چاروں دواوین سے ایسے اشعار پیش کیے ہیں جن میں غالب کے رنگِ سخن کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔ ان اشعار کی تعداد سو ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ داغ کے دیوان اول "گلزارِ داغ" میں ایسے اشعار کی تعداد سب سے زیادہ ہے، دوسرے اور تیسرے دواوین میں یہ اثرات کم ہیں لیکن چوتھے دیوان میں جو داغ کی وفات کے بعد چھپا غالب کا اثر زیادہ اشعار میں دیکھا جاسکتا ہے۔ رضا صاحب کے نشان کردہ اشعار میں سے نمونتاً چند اشعار یہاں پیش کیے جاتے ہیں :

گلزارِ داغ :

سرشکِ تلخ کی تلخی گوارا ہے تو ہم کو ہے
زمیں پیتی نہیں آنسو ہماری چشمِ گریاں کا

○

بلبل کی داستان سنی گوشِ گل نے کب
انسان ہی کو لطف ہے گفت و شنید کا

○

دستِ ہوس بڑھا کر کیوں مرتبہ گھٹایا
سمجھی نہ یہ زلیخا دامن ہے پارسا کا

○

یاں بھی مشتاق کی قسمت میں کوئی جلوہ ہے
یا فقط حشر ہی پر وعدۂ دیدار رہا

○

کم نہ تھی شوخیِ رفتار سے بیتابیِ شوق
راہ میں پاؤں پڑا ان کے برابر اپنا

○

آفتاب داغ :

بعد فنا بھی اور مکدّر کیا اسے
میرا غبار میرے لیے آسماں ہے اب

○

کہاں اے چارہ گر دل میں حرارت
یہ گرمی ہے فقط ضبطِ فغاں کی

○

انتظارِ نفسِ بازپسیں ہے ہر دم
سرِ منزل ہوں مگر دوریِ منزل ہے وہی

○

انتہا عشق کی خدا جانے
دمِ آخر کو ابتدا کہیے

مہتاب داغ :

یہ عقدہ عاشق و معشوق کے چلن سے کھلا
سمجھ میں مسئلہ جبر و اختیار آیا

○

نکہتِ گل میں ہے لپٹ اور ہی
کس نے یہاں بندِ قبا وا کیا

○

پڑتی ہے ضربِ محبت تو نکلتی ہے فغاں
شورِ محشر سے ہم آہنگ ہے نقارۂ دل

○

گو مرے پاس نہیں غیر متاعِ کاسہ
میں تماشائیِ اندازِ خریدار تو ہوں

یادگارِداغ :

تجلّی جلوہ گر لاکھوں حجابوں میں بھی ہوتی ہے
چھپائے سے چھپے رنگِ ظہور، ایسا نہیں ہوتا

○

ٹھوکر بھی راہِ عشق میں کھانی ضرور ہے
چلتا نہیں ہوں راہ کو ہموار دیکھ کر

○

محوِ قدِ یار ہوگئے ہم
سولی پہ چڑھے تو سوگئے ہم

○

پہنچے کیا منزل پہ ایسا ناتواں
جو دبا جاتا ہے گردِ راہ سے

رضا صاحب نے داغ کے ایک ایسے شعر کی نشاندہی بھی کی ہے جو کچھ تحریف کے ساتھ دیوانِ غالب کے نسخہ نظامی میں شامل ہوگیا تھا اور ۱۹۹۴ء تک جب رضا صاحب کی نظر اس سہو پر گئی، یہ غالب ہی سے منسوب رہا۔ دیوانِ غالب نسخہ نظامی میں یہ شعر اس طرح درج ہوا ہے :

ذرا کر زور سینے پر کہ تیر پُر ستم نکلے
جو وہ نکلے تو دل نکلے جو دل نکلے تو دم نکلے

داغ کا شعر اصلاً اس طرح ہے :

نکال اب تیر سینے سے کہ جانِ پُر الم نکلے
جو یہ نکلے تو دل نکلے جو دل نکلے تو دم نکلے

اِس زمین میں بہادر شاہ ظفر کا ایک شعر بھی محرف شکل میں غالب کے کھاتے میں جا پڑا تھا مگر اس کا علم لوگوں کو بہت پہلے ہو گیا تھا۔ ظفر کا شعر تھا :

خدا کے واسطے زاہد اٹھا پردہ نہ کعبے کا
کہیں ایسا نہ ہو یاں بھی وہی کافر صنم نکلے

کلامِ غالب میں شمولیت کے بعد مصرعۂ اول کی شکل یہ ہو گئی تھی :

خدا کے واسطے پردہ نہ کعبے کا اٹھا ظالم

داغ اور ظفر دونوں کے اشعار میں جو تحریف ہوئی ہے، وہ تحریف کرنے والوں کی کم ذوقی پر دلالت کرتی ہے۔

غزلوں کا مختصر انتخاب

غزلوں کا مختصر انتخاب

داغ نے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے لیکن ان کا خاص میدان غزل ہے۔ ذیل میں ان کے دواوین سے کچھ غزلوں کے منتخب اشعار پیش کیے جا رہے ہیں۔
داغ کو معاملاتِ حسن و عشق کا شاعر سمجھا جاتا ہے اور یہ درست بھی ہے لیکن کبھی کبھی ان کی نظر زندگی کے دوسرے پہلوؤں پر بھی جاتی ہے۔ اس انتخاب میں کوشش کی گئی ہے کہ اس رنگ کی بھی کچھ نمائندگی ہو سکے۔

"گلزارِ داغ" سے :

صبر لے زاہدِ نافہم نہ مے خواروں کا
بخشنے والا بھی دیکھا ہے گنہ گاروں کا

○

لیے تو چلتے ہیں حضرتِ دل تمھیں بھی اس انجمن میں لیکن
ہمارے پہلو میں بیٹھ کر تم ہمیں سے پہلو تہی نہ کرنا

○

عشق نے خوب کیا ظاہر و باطن یکساں
داغ جو سینے پہ دیکھا وہی دل پر نکلا

جذبِ دل کا ہو برا، کھینچ بلایا اس کو
جو نہ در تک کبھی آیا تھا، وہ باہر نکلا
آفریں داغ تجھے، خوب نباہی تو نے
مرحبا، کوچہ دلدار سے مرکر نکلا

○

جب یقینِ عشق آیا پھر وہ بُت کہاں اپنا
آگئے غضب میں ہم دے کے امتحاں اپنا
دھوم صبحِ محشر کی داغ سنتے آتے ہیں
پر نہیں کچھ اندیشہ خواب ہے گراں اپنا

○

گل کھلاتا ہے خزاں میں بھی مرا دستِ جنوں
جب چھلے زخمِ کہن اک تازہ گلشن بن گیا
مستِ مے کل تک تو میخانے میں تھا، اور آج داغ
داغِ مے دامن سے دھوکر پاکدامن بن گیا

○

پورا ہوا نہ ایک بھی دل کا مسوّدہ
فرسودہ لاکھ بار قلم ہوکے رہ گیا
دل نے تری گلی سے نہ اٹھنے دیا مجھے
سو بار، قصدِ دیر و حرم ہوکے رہ گیا
اے داغ ہم نہ دیکھ سکے روزِ حشر کو
سر خجلتِ گناہ سے خم ہوکے رہ گیا

○

اُس بزم میں شریک تو جایا نہ جائے گا
میں جاؤں گا، اگر مرا سایا نہ جائے گا

دل کیا ملاؤ گے کہ ہمیں ہو گیا یقیں
تم سے تو خاک میں بھی ملایا نہ جائے گا

○

جو ہو سکتا ہے اس سے، وہ کسی سے ہو نہیں سکتا
مگر دیکھو تو، پھر کچھ آدمی سے ہو نہیں سکتا
نہ رونا ہے طریقے کا نہ ہنسنا ہے سلیقے کا
پریشانی میں کوئی کام جی سے ہو نہیں سکتا
خدا جب دوست ہے اے داغ، کیا دشمن سے اندیشہ
ہمارا کچھ کسی کی دشمنی سے ہو نہیں سکتا

○

سب خاک ہوئیں آج مرے دل کی امیدیں
کل تک تو تری ذات سے کیا کیا نہ یقیں تھا
اب دل میں ہوا تیری جگہ درد کا مسکن
یہ وہ ہی مکاں ہے، کبھی تو جس میں مکیں تھا

○

سفارش ہم تری کرتے، پر اے داغ
کچھ ان کا تجھ سے رُخ اچھا نہ پایا

○

عیش بھی اندوہ فزا ہو گیا
ہائے طبیعت تجھے کیا ہو گیا
آپ سے اقرار کے سچے کہاں
وعدہ کیا اور وفا ہو گیا

○

تم کہتے ہو معشوق اطاعت نہیں کرتے
عاشق بھی تو معشوق کا نوکر نہیں ہوتا
اے داغ نہ دے جان محبت میں کہ ناداں
پھر زندہ جہاں میں کوئی مر کر نہیں ہوتا

○

جو تمھاری طرح تم سے کوئی جھوٹے وعدے کرتا
تمھیں منصفی سے کہہ دو، تمھیں اعتبار ہوتا
ترے وعدے پر ستمگر ابھی اور صبر کرتے
اگر اپنی زندگی کا ہمیں اعتبار ہوتا

○

رہبر نے راہِ عشق میں برسوں دیے چکر مجھے
ظالم سے جب پوچھا، کہا: اب آگئے منزل کے پاس
بحر محبت جوش پر، میں کیا کروں، نومشق ہوں
دم ٹوٹ جاتا ہے مرا آتا ہوں جب ساحل کے پاس

○

آئے وہ بے وفا یہاں، اس کی بلا کو کیا غرض
جائے درِ قبول تک میری دعا کو کیا غرض
اس کی گلی سے آئے کیوں، نکہتِ زلف لائے کیوں
مجھ کو صبا سے ہے امید، مجھ سے صبا کو کیا غرض

○

تعریفِ حسن سن کے وہ بولے: بہت بجا
مضمونِ شوق پڑھ کے کہا: یک قلم غلط

بولے وہ، داغ آپ ہیں جھوٹوں کے بادشاہ
معشوق سے شکایتِ جور و ستم غلط

○

سیلِ سرشک اپنے ہی گھر میں بہائیں گے
کیوں جائے یہ بلا تری دیوار کی طرف
بیکس رہیں گے حشر میں کب مجرمانِ عشق
رحمت کہے گی: ہم ہیں گنہ گار کی طرف

○

ہزاروں دوست دشمن بزم میں اس کی رہے لیکن
رہا اک شکل پر نظم و نسق اوّل سے آخر تک

m

اس کی تلاش میں مگر ایک کا ایک ہے رقیب
پھرتے ہیں روز و شب جو یوں شمس و قمر الگ الگ

○

قصدِ صحرا ہے دلِ ویراں کے ساتھ
اک بیاباں لے چلے ہیں گھر سے ہم
حضرتِ واعظ نے جو چاہا، کہا
پر نہ بولے کچھ خدا کے ڈر سے ہم
وہ ستمگر رو بہ رو ہوگا تو داغ
کیا کہیں گے داورِ محشر سے ہم

○

مطلب کی چھیڑ ان سے پنہاں سخن سخن میں
سچ ہے کہ داغِ پُرفن یکتا ہے اپنے فن میں

اس رنج بے کسی کی یا رب خبر نہ پہنچے
جائے نہ شامِ غربت سر پیٹتی وطن میں

○

دستِ وحشت کے لیے تاب رگِ جاں میں نہیں
ہاتھ اس تار میں الجھا جو گریباں میں نہیں

○

کیا کیا فریب دل کو دیے اضطراب میں
اُن کی طرف سے آپ لکھے خط جواب میں
اے داغ کوئی مجھ سا نہ ہوگا گناہگار
ہے معصیت سے میری، جہنم عذاب میں

○

ساز، یہ کینہ ساز کیا جانیں
ناز والے، نیاز کیا جانیں
کب کسی در کی جبہہ سائی کی
شیخ صاحب نماز کیا جانیں
جن کو اپنی خبر نہیں اب تک
وہ مرے دل کا راز کیا جانیں
جو گزرتے ہیں داغ پر صدمے
آپ بندہ نواز کیا جانیں

○

میخانے کے قریب تھی مسجد بھلے کو داغ
ہر ایک پوچھتا ہے کہ حضرت اِدھر کہاں

○

دل میں سماگئی ہیں قیامت کی شوخیاں
دو چار دن رہا تھا کسی کی نگاہ میں
آتی ہے بات بات مجھے یاد بار بار
کہتا ہوں دوڑ دوڑ کے قاصد سے راہ میں

○

ہم تو دشمن کو دوست کرلیتے
پر کریں کیا تری خوشی ہی نہیں

○

نہیں ہوتی بندے سے طاعت زیادہ
بس اب خانہ آباد، دولت زیادہ
بہکتے نہ تھے داغ یوں گفتگو میں
مگر پی گئے آج حضرت زیادہ

○

جب پاؤں تھکے تو جستجو کی
جب دل نہ رہا تو آرزو کی
ہم بادہ کشوں کی خاک سے بھی
آئے گی صدا سبو سبو کی

○

داغ کہتے ہیں جنھیں، دیکھیے وہ بیٹھے ہیں
آپ کی جان سے دور، آپ پہ مرنے والے

○

فسردہ دل کبھی خلوت نہ انجمن میں رہے
بہار ہو کے رہے ہم تو جس چمن میں رہے

○

کہتے ہو، کچھ کہو، کہوں کیا خاک
جانتا ہوں، مزاج برہم ہے

○

روح کس مست کی پیاسی گئی میخانے سے
مے اڑی جاتی ہے ساقی ترے پیمانے سے
ایک چلو میں بہت داغ بہک اٹھے تھے
سنتے ہیں، آج نکالے گئے میخانے سے

○

"آفتاب داغ" سے :

غیر کا ذکرِ وفا اور ہمارے آگے
داغ اس بات سے جلتا ہے کلیجا کیسا

○

تری گلی میں رہی بازگشت مثلِ نفس
کہ جتنی دور گیا، واپس اتنی دور آیا

○

انکارِ میکشی نے مجھے کیا مزا دیا
سینے پہ چڑھ کے اس نے خُمِ مے پلا دیا

○

ذرا ڈال دو اپنی زلفوں کا سایہ
مقدر بہت نارسا ہے کسی کا

○

اُن کے گھر داغ جاکے دیکھ لیا
دل کے کہنے میں آکے دیکھ لیا

سب یہ کہتے تھے: چپ لگی ہے تجھے
حالِ دل بھی سنا کے دیکھ لیا

○

یہ حسیں، یہ مہ جبیں، یہ شہر، ایسی لہر بہر
داغ کلکتے سے لاکھوں داغ دل پر لے چلا

○

راہ پر ان کو لگالائے تو ہیں باتوں میں
اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں
یا رب اس چاند کے ٹکڑے کو کہاں سے لاؤں
روشنی جس کی ہو ان تاروں بھری راتوں میں
وہ گئے دن جو رہی یاد بتوں کی اے داغ
رات بھر اب تو گزرتی ہے مناجاتوں میں

○

کچھ داغ کا مذکور جو آیا تو وہ بولے
آئے تھے برا حال بنائے، مرے آگے

○

پھرے راہ سے وہ، یہاں آتے آتے
اجل مر رہی تو کہاں آتے آتے
نہ جانا کہ دنیا سے جاتا ہے کوئی
بہت دیر کی مہرباں آتے آتے
نتیجہ نہ نکلا تھکے سب پیامی
وہاں جاتے جاتے یہاں آتے آتے
سنانے کے قابل جو تھی بات ان کو
وہی رہ گئی درمیاں آتے آتے

مرے آشیاں کے تو تھے چار تنکے
چمن اڑگیا، آندھیاں آتے آتے
نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہہ دو
کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے

○

اس عشق میں کسی کا اجارا نہیں ہے داغ
پروردگار جس کو یہ نعمت عطا کرے

○

داغ کو چین ہی نہیں آتا
اُس سے جب تک برا بھلا نہ سنے

○

داغ! میں پر چاہی لوں گا باتوں باتوں میں انھیں
شرط یہ ہے میرا اُن کا سامنا ہونے لگے

○

ناروا کہیے ناسزا کہیے
کہیے کہیے، مجھے برا کہیے
آگئی آپ کو مسیحائی
مرنے والوں کو مرحبا کہیے

○

داغ سا بھی کوئی شاعر ہے، ذرا سچ کہنا
جس کے ہر شعر میں ترکیب نئی، بات نئی

○

ہر ادا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی
اف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی
ٹوک کر رستے میں، پیار آ ہی گیا اس شوخ پر
وہ نظر حیرت زدہ، وہ آنکھ شرمائی ہوئی
دیکھ کر قاتل کی آمد، داغ دل میں شاد شاد
اور غمخواروں کے منہ پر مردنی چھائی ہوئی

○

"مہتاب داغ" سے :

یہ مجھ سے کہنے کو ظالم سر مزار آیا
مرے بغیر تجھے کس طرح قرار آیا
گزر گئے اسی گردش میں اپنے لیل و نہار
شبِ فراق گئی روزِ انتظار آیا

○

لے چلا جان مری، روٹھ کے جانا تیرا
ایسے آنے سے تو بہتر تھا نہ آنا تیرا

○

کون بے کس کی زمانے میں خبر لیتا ہے
دل نے سینے میں بہت شور مچایا تنہا

○

جواب اس طرف سے بھی فی الفور ہو گا
دبے آپ سے وہ کوئی اور ہو گا

○

تمھارے خط میں نیا اک سلام کس کا تھا
نہ تھا رقیب تو آخر وہ نام کس کا تھا
رہا نہ دل میں وہ بے درد اور درد رہا
مقیم کون ہوا ہے، مقام کس کا تھا

○

زمیں سے قدم عرش پر لے گیا
فرشتوں سے بازی بشر لے گیا

○

اِدھر دیکھ لینا، اُدھر دیکھ لینا
کنکھیوں سے اس کو مگر دیکھ لینا

○

گرچہ پہنچا ہوں میں کہیں سے کہیں
مرحلہ دور ہے رسائی کا
نہ رہا لطف اس زمانے میں
میرزا داغ، میرزائی کا

○

امّید اس کی ذات سے اے داغ چاہیے
سب منحصر ہے رحمتِ پروردگار پر

○

وہ کب لطف کرتے ہیں بے آزمائے
کرم آخر آخر عتاب اوّل اوّل
ہوئی داغ اب ان کی تعبیر الٹی
نظر آئے جو ہم کو خواب اوّل اوّل

○

شاہ میرا قدرداں، احباب میرے مہرباں
میں دکن میں جب سے ہوں اے داغ اک جنت میں ہوں

○

تماشائے دیر و حرم دیکھتے ہیں
تجھے ہر بہانے سے ہم دیکھتے ہیں

○

کل جو تھا آج وہ مزاج نہیں
اس تلوّن کا کچھ علاج نہیں
بے نیازی کی شان کہتی ہے
بندگی کی کچھ احتیاج نہیں

○

یہ داغِ قدح خوار کے کیا دل میں سمائی
سنتے ہیں، کیے بیٹھے ہیں وہ رات سے توبہ

○

تم اِترائے کہ بس مرنے لگا داغ
بناوٹ تھی جو وہ حالت کبھی تھی

○

غیر سے میری طرفداری ہے
یہ نئی طرح کی عیّاری ہے

داغ دشمن سے بھی جھک کر ملیے
کچھ عجب چیز ملنساری ہے

○

بندۂ عشق ہو ایسے، کہ الٰہی توبہ
تم تو معشوق کو اے داغ خدا مان گئے

○

لو، دو ہی دن کے بعد یہ ان کا خیال ہے
چھوڑو بھی رسم و راہ کہاں کا وبال ہے
لیل و نہار اپنے گزرتے ہیں ایک شکل
جو شب کو خواب تھا، وہی دن کو خیال ہے

○

مٹ چکی ہے خلشِ دل مگر اب بھی اے داغ
پھانس کی طرح کھٹک جاتا ہے ارماں کوئی

○

شکستِ عہد سے ہوتا ہی کیا ہے
انھیں اس بات کی پروا ہی کیا ہے

○

مارڈالے گی قفس میں بوئے گل
ہم اسیروں سے ہوا بچ کر چلے

○

"یادگارِ داغ" سے :

وہ ساتھ غیر کے مرے ہمسائے میں رہے
اے آسماں بتا پسِ دیوار کیا ہوا

○

کہتا ہوں تو رکتی ہے زباں سامنے اس کے
لکھتا ہوں اگر حال تو لکھا نہیں جاتا

وہ کہتے ہیں، کیا جور اٹھاؤ گے تم اے داغ
تم سے تو مرا ناز اٹھایا نہیں جاتا

○

پہرے بیٹھے ہیں وہاں غیروں کے اندر باہر
روز ہم پھر کے چلے آتے ہیں، باہر باہر
جلوہ بے تاب جو ہوتا ہے تو کب چھپتا ہے
بجلیاں کوندتی ہیں پردے کے اندر باہر
دل لگی ہو تو کہیں داغ کا دل بھی بہلے
اُس کو یکساں ہے جدائی میں تری گھر، باہر

○

داغ تم دل کو دوست سمجھے ہو
دوستی کا گمان دشمن پر!

○

ایسے پامالوں کے مرمٹنے پہ رشک آتا ہے
جن کو مٹّی ترے نقشِ کفِ پا دیتے ہیں
کعبے والوں نے تو اے داغ دیا صاف جواب
اہلِ بت خانہ ہمیں دیکھیے کیا دیتے ہیں

○

پہلے تو سمجھتا ہوں کہ ہیں درپئے آزار
پھر دل میں یہ آتا ہے، وہ ایسے تو نہیں ہیں
تکلیف محبت کی چھپائے نہیں چھپتی
صدمے ترے دل پر بہت اے داغِ حزیں ہیں

○

داغ کو تم سے مری جان یہ امّید نہ تھی
جھوٹے منہ بھی تو نہ پوچھا کہ پریشاں کیوں ہو؟

○

اے فلک تیری مہربانی کیا
داغ کا مہربان اور ہی ہے

○

یہ پیشتر زمیں سے ہے یا آسماں سے ہے
کیا جانے ابتدائے محبت کہاں سے ہے
پیری میں داغ جوشِ مضامیں ہے رنگ پر
اس باغ کی بہار ہماری خزاں سے ہے

○

نکالوں کس طرح خارِ تمنا سخت مشکل ہے
وہ اس ڈر سے نہیں چھوتے کہ یہ کانٹوں بھرا دل ہے
نہ گھبرا عقدۂ دشوار سے اے داغ تو ہرگز
قسم مشکل کشا کی، یہ کوئی مشکل میں مشکل ہے

○

جنابِ داغ اب سنبھلیں گے کیا خاک
کہ یہ بگڑے ہوئے ہیں عمر بھر کے

○

دھوکے دیتی ہیں سر بزم نگاہیں کیا کیا
کس طرف تیری توجہ ہے، کدھر مائل ہے
وادیِ عشق میں رکھتا ہوں قدم رک رک کر
راہزن کا وہیں کھٹکا ہے جہاں منزل ہے

حضرتِ داغ کا اقبال بہت چمکے گا
ہم دکھا دیں گے اگر فضلِ خدا شامل ہے

○

یہ انتخاب، داغ کے چار دواوین "گلزار داغ" (۱۸۷۸ء) "آفتابِ داغ" (۱۸۸۵ء) "مہتابِ داغ" (۱۸۹۴ء) اور "یادگارِ داغ" (۱۹۰۵ء) سے کیا گیا ہے۔ "یادگارِ داغ" کی اشاعت کے چند سال بعد کچھ کلام "ضمیمۂ یادگار داغ" کے نام سے بھی شائع ہوا تھا جو اس انتخاب کے وقت میرے سامنے نہیں رہا ـــــ داغ کا کچھ کلام ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ دار و گیر میں تلف ہو گیا تھا، ایک مرتب شدہ دیوان ان کے زمانۂ قیامِ حیدر آباد میں چوری ہو گیا تھا۔ داغ کے انتقال کے بعد ایک اور دیوان کچھ جھگڑا اٹھ کھڑا ہونے کی وجہ سے نظام نے اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ اب وہ کہاں ہے، نہیں کہا جا سکتا۔

اس کتاب کی ترتیب میں

مندرجۂ ذیل مآخذ سامنے رہے

۱۔	گلزارِ داغ	دیوانِ اوّل	۱۸۷۸ء
۲	آفتابِ داغ	دیوانِ دوم	۱۸۸۵ء
۳۔	مہتابِ داغ	دیوانِ سوم	۱۸۹۳ء
۴	یادگارِ داغ	دیوانِ چہارم	۱۹۰۵ء
۵۔	مثنوی فریادِ داغ		۱۸۸۲ء
۶۔	جلوۂ داغ	احسن مارہروی	۱۹۰۲ء
۷۔	آئینۂ داغ	محمد نثار علی شہرت	۱۹۰۵ء
۸۔	گلکدۂ داغ	نواب عزیز یار جنگ	۱۳۶۴ھ
۹۔	بہارِ داغ	سید نذیر نیازی	۱۹۴۰ء
۱۰۔	ماہنامہ نگار	لکھنؤ، داغ نمبر	۱۹۵۳ء
۱۱۔	زبانِ داغ	رفیق مارہروی	۱۹۵۵ء
۱۲۔	بزمِ داغ	رفیق مارہروی	۱۹۵۶ء
۱۳۔	رسالہ نورس		اپریل ۱۹۵۸ء

۱۴۔	داغ	تمکین کاظمی	۱۹۶۰ء
۱۵۔	فسانۂ غالب	مالک رام	۱۹۷۷ء
۱۶۔	داغ دہلوی	مرتبہ کامل قریشی	۱۹۸۶ء
۱۷۔	جہاں استاد داغ دہلوی	کالی داس گپتا رضا	۱۹۹۷ء
۱۸۔	غالب اور سرزمینِ ہریانہ، مرتبہ کشمیری لال ذاکر		۲۰۰۰ء
۱۹۔	داغ دہلوی	مرتبہ شاہد ماہلی	۲۰۰۱ء

نواب مرزا خاں داغ دہلوی اپنے عہد کے سب سے مقبول شاعر تھے اور اپنی زندگی ہی میں انھوں نے ایک دبستان کی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ ان کے جانشین نوح ناروی کا بیان ہے کہ داغ کے دو ہزار شاگرد تھے جن میں سے کئی خود بھی استادی کے درجے کو پہنچے اور انھوں نے بھی بہت سے نو مشق شاعروں کے ذہن وذوق کی تربیت کی۔

داغ شاعری کے ان تمام اصناف پر قادر تھے جو اُن کے زمانے میں مروّج تھیں لیکن ان کی پہلی پہچان قرار پائی ان کی غزل۔ انھوں نے "فریادِ داغ" کے تاریخی نام سے جو مثنوی لکھی اُسے بھی غیر معمولی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ داغ کی غزل ان کے عاشقانہ مزاج کی ترجمان ہے، اس مثنوی میں بھی انھوں نے اپنی ایک وارداتِ عشق بیان کی ہے۔

جذبے کی سچائی کے ساتھ ساتھ اظہار کی بے تکلفی اور زبان کی سلاست، ایسی سلاست جیسے کسی خوش خرام ندی کا بہاؤ، داغ کی شاعری کی امتیازی خصوصیت ہے جس میں ان کا کوئی ہم عصر ان کا شریک نہیں۔ ان کا یہ دعویٰ غلط نہیں تھا:

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

مخمور سعیدی موجودہ دور کے ممتاز شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کے دس مجموعے شائع ہو کر قبولِ عام کی سند پا چکے ہیں۔ اردو کے کلاسیکی سرمائے پر ان کی گہری نظر ہے اور فارسی زبان و ادب سے بھی ان کی قریبی شناسائی ہے۔ غالب کی مشہور فارسی تصنیف "دستنبو" کو انھوں نے غالب ہی کے اسلوب میں اردو میں منتقل کیا ہے۔ بہ حیثیت شاعر انھوں نے کئی بیرونی ملکوں میں ہندستان کی نمائندگی کی ہے۔

مخمور سعیدی نثر نگار بھی ہیں۔ ان کی نثری کتابوں کی تعداد ڈیڑھ درجن ہے۔ وہ اردو کے کئی اہم رسالوں کے مدیر اور دلّی اردو اکادمی کے سکریٹری رہے ہیں۔ آج کل قومی اردو کونسل میں ادبی مشیر ہیں۔

Daagh Dehlavi (Urdu)
ISBN 81-260-1626-4 Rs. 25